قرآن اور سائنس

(افاداتِ سید قطبؒ)

ترجمہ

پروفیسر محمد نجات اللہ صدیقی

اور

سلطان احمد اصلاحی

اسلامک پبلیکیشنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ

۱۳- ای، شاہ عالم مارکیٹ، لاہور (پاکستان)

طابع :۔ ——— رانا اللہ داد خاں، مینجنگ ڈائریکٹر

ناشر :۔ ——— اسلامک پبلیکیشنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ
١٣،ای شاہ عالم مارکیٹ، لاہور

مطبع :۔ ——— میٹرو پرنٹرز، لاہور

اشاعت :۔

١ تا ٣	جولائی	١٩٩١ء	٣٣٠٠
٤	مارچ	١٩٩٣ء	١١٠٠
٥	دسمبر	١٩٩٥ء	١١٠٠

قیمت :۔ ٢١/٠٠ روپے

فہرست عنوانات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تعارف

سید قطبؒ کسی تعارف کے محتاج نہیں[1]۔ وہ ہمارے دور کے ایک عظیم اسلامی مفکر تھے جن کی تصانیف نے عصرِ حاضر میں اسلامی فکر کی تحقیق و توضیح میں نمایاں حصہ لیا ہے اور وسیع پیمانہ پر اس کی ترجمانی کی ہے۔ ان کی متعدد تصانیف کو غیر معمولی قبولِ عام حاصل ہوا ہے اور ان کے ترجمے ایک درجن سے زیادہ زبانوں میں ہو کر ساری دنیا میں پھیل چکے ہیں۔ تحریکِ اسلامی کے ایک عملی مجاہد کی حیثیت سے انھوں نے گیارہ برس تک جیل خانہ کی اذیتیں سہنے کے بعد شہادت کا بلند مرتبہ بھی پایا جس کے سبب وہ ساری دنیا کے مسلمانوں کے نزدیک ایسی عظمت و احترام کے قابل قرار پائے جس کی نظیر قریب کے زمانہ میں ملنی دشوار ہے۔

سید قطبؒ نے اسلامی نظامِ زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے

---

[1] ملاحظہ ہو "اسلام میں عدلِ اجتماعی" مطبوعہ اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ لاہور

اور تحریک اسلامی کے مقصد و منہاج پر بھی گفتگو کی ہے۔ لیکن ان کا امتیازی کارنامہ
یہ ہے کہ انھوں نے قرآن حکیم کو عصر حاضر کے ایک صاحب علم انسان اور ایک
صاحب فراست مومن کی حیثیت سے گہرائی میں اتر کر سمجھا اور سمجھایا ہے۔ التصویر الفنی
فی القرآن اور مشاہد القیامہ جیسی مستقل تصانیف کے علاوہ انھوں نے تقریباً چھ ہزار
صفحات پر مشتمل تفسیر قرآن بھی لکھی ہے جس کے متعدد ایڈیشن فی ظلال القرآن کے نام
سے شائع ہو چکے ہیں یہ تفسیر بعض امتیازی خصوصیات کی حامل ہے جن میں سے ایک
خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں فکر اسلامی کے ان پہلوؤں کی خاص طور پر وضاحت
کی گئی ہے جن کا تعلق جدید علوم، عصر حاضر کے فکر اور سائنس سے پیدا ہونے والے سوالات
سے ہے۔

قرآن کا مطالعہ کرنے والے جدید تعلیم یافتہ افراد کے سامنے اکثر یہ سوال آتا
ہے کہ قرآن اور سائنس میں کیا تعلق پایا جاتا ہے۔ کیا قرآن ایسے حقائق کا بھی انکشاف
کرتا ہے جنھیں عام طور پر سائنس کا موضوع تفتیش سمجھا جاتا ہے؟ کیا سائنس کے بعض
انکشافات قرآنی بیانات کی توثیق کرتے ہیں اور ان کو قرآن کی صداقت کی دلیل بنایا
جاسکتا ہے۔ کیا سائنس کے بعد بعض انکشافات قرآن کے بیانات سے ٹکراتے ہیں؟
اگر ایسا ہے تو اس تضاد کی توجیہہ کیونکر کی جائے۔ اگر سائنس کے نظریات اور قرآن
کے بیانات میں ٹکراؤ پایا جائے تو ایک مومن کا رویہ کیا ہونا چاہئے۔ یہ رویہ اختیار
کرنے کے ساتھ وہ سائنس کا ایک طالب علم ہونے کی حیثیت سے کیا موقف اختیار
کرے گا؟ ان سوالات کے ضمن میں عقل انسانی اور وحی الٰہی کے اضافی مقام اور باہمی
تعلق کا مسئلہ بھی سامنے آتا ہے۔ وحی کی ضرورت کیا ہے۔ عقل کی رسائی کے حدود کیا

ہیں اور وحی سے حاصل ہونے والی رہنمائی کے سلسلہ میں عقل کا منصب اور وظیفۂ عمل
کیا قرار پاتا ہے۔ یہ وہ اصولی سوالات ہیں جو ہمیشہ سے اہل مذہب کے سامنے
آتے رہے ہیں۔ حکماء، فلسفی اور متکلمین ہر زمانہ میں ان کے تشفی بخش جواب تلاش
کرتے رہے ہیں۔ کیونکہ ان کا تشفی بخش جواب ایک دانشمند انسان کے ایک پختہ
صاحب ایمان ہونے کے لئے ناگزیر رہا ہے۔ دور جدید میں بھی علماء اسلام نے
اس موضوع پر گفتگو کی ہے۔ سید قطبؒ نے اپنی معرکۃ الآراء تفسیر میں بھی یہ سوالات
اٹھائے ہیں اور ان کے جواب دینے کی کوشش کی ہے چونکہ اردو زبان میں ابھی
تک ان کی تفسیر کا ترجمہ نہیں ہو سکا ہے اس لئے موضوع کی اہمیت کے پیش نظر
مفید سمجھا گیا کہ تفسیر کے بعض ایسے حصوں کا ترجمہ پیش کر دیا جائے جو خاص طور پر ان
سوالات سے تعرض کرتے ہیں۔

آج سے پانچ چھ سال پہلے رسالہ زندگی (رام پور) میں مسئلہ ارتقاء پر
ایک بحث چھڑ گئی تھی۔ اس وقت میں نے فی ظلال القرآن کے چند ایسے اقتباسات
کا ترجمہ زندگی میں شائع کیا تھا جو مسئلہ ارتقاء سے بھی تعرض کرتے تھے مگر ساتھ ہی
ان میں مذکورہ بالا دوسرے امور پر بھی روشنی ڈالی گئی تھی۔ ان اقتباسات کا ترجمہ
پیش کرنے کے ساتھ ہی تفسیر کے تین ایسے مقامات کی نشاندہی کی گئی تھی جو عقل اور
وحی اور انسانی علوم سے متعلق مباحث پر مشتمل ہیں مگر طوالت کے سبب ان کا ترجمہ اس
وقت نہیں پیش کیا جا سکا تھا۔ مجھے بڑی مسرت ہے کہ میری تحریک پر سلطان احمد اصلاحی
صاحب نے ادارۂ تصنیف، جماعت اسلامی ہند، علی گڈھ، میں زیر تربیت رہنے کے

دوران میں ان تینوں اقتباسات کا بھی ترجمہ کر دیا جو مجموعی طور پر تفسیر کے بیس صفحات پر مشتمل ہیں۔ پیشِ نگاہ مجموعہ تفسیر فی ظلال القرآن کے گیارہ مختلف اقتباسات پر مشتمل ہے جن میں سے آٹھ رسالۂ زندگی۔ رام پور جلد ۴۵ شمارہ ۱ و ۲ (جولائی اور اگست ۱۹۷۰) میں شائع ہو چکے ہیں۔ ان اقتباسات کی مکمل فہرست تفسیر کے صفحات کے حوالہ کے ساتھ آگے درج کی جا رہی ہے۔ اس مجموعہ میں یہ اقتباسات اسی ترتیب کے ساتھ پیش کئے جا رہے ہیں جس ترتیب کے ساتھ وہ اصل عربی تفسیر میں آئے ہیں صفحات کے حوالے تفسیر کے پانچویں ایڈیشن کے ہیں جو آٹھ جلدوں میں کویت کی وزارتِ اوقاف نے ۱۹۶۷ء میں شائع کیا تھا۔

مصنفؒ کا فکر

مصنفؒ نے اوپر اٹھائے گئے سوالات پر ایک علمی مقالہ کے انداز میں مبسوط بحث نہیں کی ہے بلکہ مختلف آیات قرآنی کی تفسیر کے دوران ان پہلوؤں سے تعرض کیا ہے جو متعلقہ آیات کی تفسیر کے لیے ضروری نظر آئے۔ زیر غور موضوع پر ان کے فکر کو پوری طرح سمجھنے کیلئے ان تمام مباحث پر ایک ساتھ نظر رکھنا ضروری ہے جو مختلف آیات کی تفسیر کے ضمن میں سامنے آتے ہیں۔ اسی لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کے اقتباسات پیش کرنے سے پہلے ہم جامع طور پر ان کے فکر کا خلاصہ بیان کر دیں۔ اس بیان میں ان کی بعض عبارتیں بھی سند کے طور پر شامل کر لی گئی ہیں۔

۱۔ سید قطبؒ نے اس حقیقت پر بہت زور دیا ہے کہ قرآن کریم کا موضوع انسان ہے جس کی رہنمائی اور ہدایت کے لیے اللہ تعالٰے نے یہ کتاب نازل فرمائی ہے۔ اس نے کائنات اور اس میں کارفرما قوانین طبیعی سے اگر تعرض کیا ہے تو اس لیے نہیں کہ

ان سے متعلق حقائق کا انکشاف کرے بلکہ اس لیے کہ مشاہدہ، محسوس، اور تجربہ میں آئی باتوں سے استدلال کے ذریعہ انسان کو وہ باتیں ماننے پر آمادہ کر سکے جن کی تعلیم دینا قرآن کا اصل کام ہے۔ وہ لکھتے ہیں :-

"قرآن نہ تو سائنٹفک نظریات کی کتاب ہے نہ وہ اس لیے آیا ہے کہ تجربی طریقہ سے سائنس مرتب کرے۔ وہ پوری زندگی کے لیے ایک نظام ہے۔ یہ نظام عقل کی تربیت کرتا ہے تاکہ وہ اپنے حدود کے اندر آزادانہ سرگرم عمل ہو سکے۔ وہ سماج کو ایسا مزاج عطا کرتا ہے کہ وہ عقل کو آزادانہ عمل کا پورا موقع دے۔ قرآن ایسی جزئیات اور تفصیلات سے نہیں تعرض کرتا جو خالص سائنٹفک ہوں۔ یہ امور عقل کی تربیت اور اس کے لیے آزادیٔ عمل کے اہتمام کے بعد عقل ہی کے لیے چھوڑ دے گئے ہیں"

(فی ظلال القرآن جلد ۵۔ پارہ ۱۷ صفحہ ۲۴، ۲۵)

"قرآن فلکیات، کیمیا یا طب کی سائنس کی کتاب بننے کے لیے نہیں آیا ہے .... مگر قرآن کے بعض پرجوش حامی کوشش کرتے ہیں کہ اس کے اندر یہ علوم تلاش کریں، اور دوسری طرف اس کے بعض نکتہ چین اس میں ان علوم کے خلاف باتوں کی ٹوہ میں لگے رہتے ہیں۔ یہ دونوں کوششیں اس کتاب کا مزاج، اس کا کردار اور اس کا میدان عمل نہ سمجھ سکنے کی دلیل ہیں"

(فی ظلال القرآن۔ جلد ۱۔ پارہ ۲ صفحات ۹۴-۹۵)

"ایک ہی منبع ہے جس سے انسان کائنات کی حقیقتوں کے تعلق سے، انسانی وجود کی حقیقت کے تعلق سے، کائنات کی غایت کے تعلق سے اور انسانی وجود کی غایت کے تعلق سے ویسے، کامل اور ہمہ گیر تصور کو اخذ کر سکتا ہے...... جس کے ذریعہ لوگ پورے کے پورے امن اور چین اور سلامتی میں داخل ہو جاتے ہیں۔ اس کائنات کے ساتھ سلامتی میں، اپنی فطرت کے ساتھ سلامتی میں، جو اس کائنات کی بھی فطرت ہے۔ اور دنیا کی اس زندگی میں انسان کے لیے جو سعی وعمل اور نشو وارتقاء میسر کیا گیا ہے اس میں بھی ایک دوسرے کے درمیان امن وآشتی اسی طریقہ کے اختیار کرنے میں مضمر ہے۔ ایک ہی منبع ہے جو رسالتوں کا منبع ہے۔"

(فی ظلال القرآن جلد ۱۔ پارہ ۳ صفحات ۹-۱۵)

۲۔ کائنات کا مطالعہ اور اس میں کارفرما تکوینی قوانین کی دریافت سید قطبؒ کے نزدیک عقل اور سائنس کا میدان کار ہے۔

"جہاں تک مادی علوم اور مختلف قسم کے وسائل کو کام میں لاتے ہوئے مادی ایجادات عمل میں لانے کا تعلق ہے یہ کام انسان کی عقل و تجربہ، اس کے اکتشافات، اس کے مفروضات اور اس کے نظریات کے سپرد ہے۔"

(فی ظلال القرآن۔ جلد ۱۔ پارہ ۲ صفحات ۹۴-۹۹)

"یہ کائنات جس کے اندر ہم زندگی بسر کر رہے ہیں اور جس کا ہم ایک

جز ہیں، اس کے اندر چند پائدار اصول کارفرما ہیں..... انسان جب علم و معرفت کی راہ میں آگے بڑھتا ہے تو انہی قوانین کے بعض گوشوں کا پتہ لگاتا ہے...... انسان کائنات کے قوانین کے ان گوشوں کا پتہ لگانے کے لیے اپنے دو بنیادی وسائل پر اعتماد کرتا ہے۔ یعنی مشاہدہ اور تجربہ۔"

(فی ظلال القرآن۔ جلد ۱۔ پارہ ۳ صفحات ۹-۱۰)

"اس سے زیادہ وسیع میدان یہ ہے کہ وہ (عقل) اس کائنات کے قوانین، اس کے اندر پائی جانے والی قوتوں اور طاقتوں اور اس کے مدفون ذخیروں کا پتہ لگائے۔ اور اس کی موجودات اور جاندار مخلوقات کی طبیعت کو سمجھنے کی کوشش کرے پھر عقل کے لیے وسیع تر میدان یہ ہے کہ وہ انسان کے لیے مسخر کی ہوئی اس کائنات اور اس کی جاندار اور غیر جاندار موجودات سے استفادہ کرے۔ زندگی کو پروان چڑھائے، اسے تبدیلیوں سے آشنا کرے، اور ترقی کے مدارج طے کرے۔"

(فی ظلال القرآن۔ جلد ۲۔ پارہ ۶ صفحہ ۲۹)

۳۔ عقل اور سائنس کی رسائی اپنے مخصوص دائرہ میں بھی صرف جزئی علم اور ایسے نتائج تک ہے جو آخری، قطعی اور مطلق نہیں قرار دیے جا سکتے کیونکہ علم کی ترقی کے ساتھ ان میں ترمیم و اضافہ، توسیع و تحدید اور تبدیلی کی گنجائش باقی رہتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"مشاہدہ و تجربہ، یہ دونوں وسائل اپنی نوعیت کے اعتبار سے جزئی ہیں یہ
نہ آخری ہیں نہ اپنے نتائج کے اعتبار سے مطلق۔ اگرچہ مدت ہائے دراز
میں بسا اوقات یہ کلی قوانین کے بعض گوشوں کی طرف رہنمائی کر دیتے
ہیں لیکن پھر یہ انکشاف، جزئی صداقت کا حامل بن کر رہ جاتا ہے۔ نہ
آخری ہوتا ہے نہ مطلق۔ اس لیے کہ ان قوانین کے مابین ہم آہنگی کا
راز قدرت کا وہی راز ہے جو دوسرے جملہ قوانین میں ہم آہنگی پیدا کرتا
ہے۔ یہ راز برابر پوشیدہ رہتا ہے۔ جزئی اور اضافی مشاہدہ اس تک
نہیں پہنچ سکتا خواہ کتنا ہی زمانہ گذر جائے۔ یقیناً اس سیاق میں زمانہ
فیصلہ کن عنصر نہیں ہے۔ یہ تو محض ایک حد کا نام ہے جو انسان کے لیے
مقرر کر دی گئی ہے، تکوینی طور پر اور کائنات میں اپنے دور کے لحاظ سے
یہ جزئی اور اضافی ہے۔

اس زمین پر پوری نوعِ انسانی کو جو مدت وقت ملی ہے وہ
بھی اپنے دور کے لحاظ سے جزئی اور محدود ہے۔ اس طرح علم و معرفت
کے تمام وسائل اور وہ تمام نتائج جن تک انسان ان وسائل کے
ذریعہ پہنچ سکتا ہے اس جزئی اور اضافی دائرہ میں محصور ہو کر رہ جاتے ہیں"
(فی ظلال القرآن جلد ۱۔ پارہ ۳ صفحات ۹-۱۰)

۴۔ وحی اور رسالت جن حقائق کے اثبات کے لیے آئے ہیں ان کو سائنس کے
ذریعہ ثابت کرنے کی کوشش ایک بے جا کوشش ہے کیونکہ وہ سائنس کے دائرہ سے
باہر ہیں۔ سائنسی طریقۂ تحقیق ان حقائق کے انکشاف یا اثبات کے لیے موزوں نہیں۔

وہ لکھتے ہیں:

"عہد حاضر کے بہت سے مفسرین نے، تقریب ذہن کے لیے، وحی کو
سائنس کے ذریعہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ ہم اس طریقہ استدلال
کے سرے سے قائل ہی نہیں اس لیے کہ سائنس کا ایک مخصوص میدان
ہے اور سائنس کے طریقے اسی میدان کے لیے موزوں ہیں۔ سائنس
کی دنیا الگ ہے اور اس کے ذرائع تحقیق و تفتیش اسی دنیا کے لیے
کارگر ہیں۔ سائنس نے کبھی بھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ روح کے بارے
میں بھی اسے کوئی ثابت شدہ چیز معلوم ہے، کہ یہ چیز اس کے دائرہ
عمل میں داخل ہی نہیں۔ یہ ایسی چیز نہیں جسے جانچ پرکھ کر ان مادی
طریقوں سے معلوم کیا جا سکے جس کے وسائل سائنس کو حاصل ہیں یہی
وجہ ہے کہ سائنسی طریقۂ تحقیق کے پابند علماء نے ہمیشہ روحانیت کے
میدان میں دخل دینے سے گریز کیا ہے .... اس میدان میں
کسی یقینی چیز کے جاننے کا ہمارے پاس کوئی راستہ نہیں سوائے ان
حقائق کے جو قرآن و حدیث کے یقینی ذرائع سے ہم تک پہنچے ہیں"
(فی ظلال القرآن جلد ۴۔ پارہ ۱۱ صفحات ۱۱۱-۱۱۲)

۵۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب عقل و وحی اور سائنس اور قرآن کے موضوعات
الگ الگ ہیں تو ان باتوں کے سلسلہ میں صحیح رویہ کیا ہے جو بظاہر دونوں کے مواد
میں مشترک ہیں۔ کبھی قرآن ایسے امور سے بحث کرتا ہے جن کی بابت حقیقت کی تلاش
سائنس کا موضوع قرار پائی ہے اور کبھی سائنس ایسے حقائق یا نظریات سامنے لاتی ہے

جن کا تعلق قرآن میں مذکور باتوں سے بھی ہے۔ یہی وہ نازک مقام ہے جس میں ہمارا
فکر لبسا اوقات صحیح راہ سے ہٹ جاتا ہے۔

سید قطبؒ کا جواب یہ ہے کہ قرآن کے منصوص بیانات کو سائنس کے نظریات
پر محمول کرکے ان کے مطابق ان کی توجیہہ و تعبیر مناسب نہیں ہے۔ قرآن میں جہاں کائنات
کے بارے میں کوئی بیان ہے تو اسے اسی اجمال کے ساتھ تسلیم کرلینا چاہئے جس
کے ساتھ وہ بیان آیا ہو۔ سائنس کے نظریات کے مطابق ان کی شرح تفصیل مناسب
نہیں۔ البتہ اس سیاق میں وہ ثابت شدہ سائنٹفک حقائق اور سائنس کے ان نظریات
کے درمیان کچھ فرق کرتے ہیں جن میں علم کی ترقی کے ساتھ تبدیلی ممکن ہے۔ ساتھ ہی
وہ یہ کہتے ہیں کہ سائنس کی معلومات میں اضافہ کے ساتھ قرآن کے فہم میں گہرائی اور
وسعت پیدا ہوسکتی ہے، اور ہمیں ان معلومات سے یہ فائدہ ضرور اٹھانا چاہئے۔ یہ
دونوں باتیں ان کی مندرجہ ذیل صراحتوں کی روشنی میں سمجھی جاسکتی ہیں۔ ایک طرف تو وہ
یہ لکھتے ہیں کہ:

"ہم اصحاب عقیدۂ قرآنی اس بات کی کوشش نہیں کرتے کہ قرآن کے
یقینی نصوص کو کسی غیر یقینی نظریہ پر محمول کریں جو آج مقبول ہے اور کل
کو رد کیا جاسکتا ہے..... واضح رہے کہ ان نظریات کی نوعیت
ان ثابت شدہ سائنٹفک حقائق سے مختلف ہے جو تجربہ کے قابل
ہیں مثلاً دھاتوں کا گرمی پاکر پھیلنا یا پانی کا بھاپ بننا اور پھر ٹھنڈک
پاکر منجمد ہوجانا..... وغیرہ"

(فی ظلال القرآن جلد ۱۔ پارہ ۲۵ صفحات ۹۴، ۹۶)

"قرآن کے عام اشارات کو سائنس کے نت نئے اور بدلتے رہنے
والے نظریات سے جوڑنے کی ہر کوشش بلکہ ان کو ان سائنٹفک
حقائق سے جوڑنا بھی جن کے بارے میں ہم اوپر بتا چکے ہیں کہ وہ
مطلق نہیں ہوتے، اولاً منہاج کے اعتبار سے غلط ہے۔ مزید برآں
اس طریقۂ کار کے کئی پہلو اور بھی ہیں جو قرآن کے مقام بلند سے کسی طرح
مناسبت نہیں رکھتے۔" (فی ظلال القرآن جلد ۱۔ پارہ ۲۔ صفحات ۹۴-۹۹)

دوسری طرف وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ:

"کبھی کبھی قرآن بعض کائناتی حقائق کی طرف اشارہ بھی کرتا ہے۔ مثلاً یہ
حقیقت جس کا بیان آیت ان السمٰوٰت والارض کانتا رتقاً
ففتقناھما میں مذکور ہے۔ اس حقیقت پر ہمارے یقین کے لیے صرف
یہ بات کافی ہے کہ یہ قرآن میں بات بیان ہوئی ہے..... ہم فلکیات
کے ان نظریات کو قبول کرتے ہیں جو قرآن کی بیان کردہ اس مجمل حقیقت
کے خلاف نہ جاتے ہوں۔ لیکن ہم قرآن کے بیان کو فلکیات کے
کسی نظریہ کے تابع نہیں بناتے، نہ انسان کے نظریات سے قرآن
کی تصدیق چاہتے ہیں کیونکہ قرآن خود ایک یقینی حقیقت ہے۔"

(فی ظلال القرآن جلد ۵۔ پارہ ۱۷۔ صفحہ ۲۴، ۲۵)

اس اقتباس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ مصنفؒ کے نزدیک اس بات کی
گنجائش ہے کہ قرآن کے کسی بیان سے موافقت کی صورت میں کسی سائنٹفک
نظریہ کی تائید کی جاسکے۔ اس سے اگلا قدم یہ ہے کہ سائنس کی منکشف کردہ

حقیقتوں سے قرآن کے فہم میں مدد لی جائے چنانچہ سورۂ حٰم السجدہ آیت ۵۳ کا حوالہ دیتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ :

"اس اشارہ کا تقاضا ہے کہ سائنس آفاق و انفس میں اللہ کی جو نشانیاں بھی دریافت کرسکے ان پر ہم مسلسل غور و فکر کرتے رہیں اور اپنے فکر میں قرآن کے معانی کو ان علمی اکتشافات کے مطابق وسیع تر کرتے رہیں۔"

(فی ظلال القرآن جلد ۱ ۔ پارہ ۲ ۔ صفحات ۹۴، ۹۹)

اس بات کو انھوں نے بعض مثالوں کے ذریعہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے جیسا کہ آئندہ صفحات کے مطالعہ سے سامنے آئے گا۔ وہ اس بات کا بھی امکان تسلیم کرتے ہیں کہ سائنٹفک معلومات میں اضافہ کے ساتھ ہمارا فہم قرآن ترقی کرسکے اور اگلی نسلوں سے لوگ سائنٹیفک معلومات کی روشنی میں پچھلی نسلوں کے لوگوں کے مقابلہ میں قرآن کو زیادہ سمجھ سکیں۔

"قرآن کی رہنمائی انسان کی تمام نسلوں کے لیے ہر ذہنی سطح کے لوگوں کے لیے، ہر طرح کے حالات میں، اور ہر طرح کے وسائل و ذرائع کے ساتھ گذاری جانے والی زندگی کے لیے ہے، چنانچہ وہ اس رہنمائی کو اس طرح پیش کرتا ہے کہ ہر ایک اس سے اس قدر اخذ کرسکے جس قدر اس کے حالاتِ زندگی اور وسائل و استعداد اس کے لیے ممکن بناسکیں۔ اس رہنمائی میں ہمیشہ ترقی پذیری باقی رہتی ہے، تاکہ زندگی آگے بڑھ سکے اور یہ رہنمائی اس کی قیادت کرسکے۔"

(فی ظلال القرآن جلد ۶ ۔ پارہ ۲۰ ۔ صفحات ۱۱۹، ۱۲۰)

اس ضمن میں ان کی یہ رائے بھی نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ قرآن نے کائنات

سے متعلق اشارات میں نزولِ قرآن کے زمانہ میں انسانوں کو عقل و فہم اور ان کی سائنٹفک معلومات کی رعایت ملحوظ رکھی ہے اور ایسے حقائق کے انکشاف سے گریز کیا ہے جس کو وہ، اس وقت تک کی معلومات کی بنیاد پر، نہیں سمجھ سکتے تھے۔ چنانچہ سورہ بقرہ آیت ۱۸۹ کی تفسیر میں وہ لکھتے ہیں کہ :

"ہوسکتا ہے کہ اس سوال کا سائنٹفک جواب دریافت کرنے والوں کو فلکیات کا نظری علم عطا کردیتا۔ بشرطیکہ ان تھوڑی معلومات کے باوجود جو انھیں اس زمانہ میں میسر تھیں، ان کے لیے اس علم کا پوری طرح سمجھ لینا ممکن بھی ہوتا۔ اس میں بہت شبہ ہے کہ ان کے لیے ایسا ممکن ہوتا کیونکہ اس طرح کا نظری علم بہت لمبے چوڑے مقدمات کا محتاج ہوتا ہے جو اس زمانہ کی پوری دنیا کی عقل و فہم کی نسبت سے سخت دشوار قرار دیئے جاسکتے ہیں۔"

(فی ظلال القرآن جلد ۱ ۔ پارہ ۲ ۔ صفحہ ۹۴، ۹۵)

۶ ۔ قرآن اور سائنس کے موضوع سے متعلق ان نکات کی وضاحت کے ساتھ سید قطبؒ نے انسانی زندگی کے عملی مسائل کی نسبت سے بھی وحی اور عقل کے اضافی مقامات پر روشنی ڈالی ہے اور یہ واضح کیا ہے کہ قرآنی ہدایات کی نسبت سے انسانی عقل کا صحیح منصب اور کردار کیا ہے۔ اگر عقل انسانی نے انسان کے لیے اصولِ زندگی وضع کرنے کی صلاحیت پائی ہوتی تو اللہ رسولوں کو نہ بھیجتا۔ رسالت عقل انسانی کی نارسائی کی سب سے بڑی دلیل ہے۔

"اگر اللہ یہ سمجھتا ہوتا .... کہ عقل ...... اس کے لیے کافی

ہے کہ وہ اپنے آپ ہدایت تک پہنچ جائے اور دنیا اور آخرت میں اپنے مصالح کا ادراک کرے ...... تو وہ اسے تنہا اس عقل کے حوالے کر دیتا کہ وہ آفاق و انفس میں ہدایت کے دلائل اور ایمان کے دواعی تلاش کرے اور اپنے لیے اس طرز عمل کی تعیین کرے جس کے مطابق اس کی زندگی بسر ہوتی ہے .... اگر ایسا ہوتا تو وہ تاریخ کے ہر دور میں اس کے پاس رسولوں کو نہ بھیجتا ...... اور نہ اپنے بندوں کے خلاف حجت اس بات کو قرار دیتا کہ ان کے پاس رسول بھیجے گئے ...... اور نہ اپنے حضور لوگوں کے لیے اس بات کو بطور حجت تسلیم کرتا کہ ان کے پاس رسول نہیں پہنچے۔"

(فی ظلال القرآن جلد ۲۔ پارہ ۶۔ صفحات ۲۵، ۲۶)

۷۔ عقل کا منصب اور اس کا وظیفہ عمل یہ ہے کہ قرآن کے نصوص کو سمجھے اور ان کا صحیح منشا متعین کرے، بدلتے ہوئے حالات پر ان کو منطبق کرے، اور جن امور کی بابت اللہ نے کوئی ہدایت نہ دی ہو ان میں دین کے مجموعی مزاج سے مناسبت رکھنے والی تفصیلات خود وضع کرے۔

"عقل کا کام یہ ہے کہ وہ رسالت کے منبع سے اخذ کرے، اور اس کا کام یہ ہے کہ وہ رسولوں سے جو کچھ اخذ کرتی ہے اسے سمجھے۔"

"اس سلسلہ میں عقل کا کام صرف اتنا ہے کہ وہ نص کا مفہوم متعین کرے، یعنی لغت اور اصطلاح کی رو سے عبارت کے جو معنی بنتے ہیں اس کے مطابق نص کا مدلول کیا ہے۔ عقل کا کام اسی پر ختم ہو جاتا ہے:

"بلاشبہ عقل کو یہ اختیار حاصل ہے کہ کسی نص سے سمجھے ہوئے ایک انسانی مفہوم کے مقابلہ میں دوسرا مفہوم پیش کرے ..... فہم و تاویل کے اس وسیع میدان میں عقل انسانی کو آزادی فکر و نظر کی پوری ضمانت حاصل ہے بشرطیکہ وہ صحیح اصولوں کے مطابق ہو اور ان ضابطوں کے تحت ہو جنہیں خود دین مقرر کرتا ہے۔ نص کے صحیح مفہوم کی تعیین اور اس کے انطباق کی صورتوں کے تعلق سے کسی انسانی ادارے کسی اقتدار، اور کسی شخص کو عقل پر پابندی لگانے کا اختیار نہیں جب کہ نص متعدد رایوں کا احتمال رکھتی ہو۔"

"وہ (اسلام) عقل کو خطاب کرتا ہے، اس معنی میں کہ دین کے اصول جن عبارتوں میں بیان ہوتے ہیں ان کے معنی کی تعیین عقل کے حوالے کی گئی ہے۔ وہ اس پر یہ لازم نہیں کرتا کہ ایسی چیز پر ایمان لائے جس کی مدلول کو وہ سمجھ نہ سکی ہو یا جس کے معانی کا وہ ادراک ہی نہ کر سکی ہو۔"

"ہم جو بات کہہ رہے ہیں اس سے کسی درجہ میں بھی عقل کی قدر و قیمت کم کرنا یا انسانی زندگی میں اس کے کردار Role کو گھٹانا لازم نہیں آتا۔ اس لیے کہ نت نئے حالات پر منطبق کرنے کا کام اس کے لیے ایک وسیع میدان فراہم کرتا ہے۔"

"اس نے انسانی عقل پر اس نظام زندگی کو تیار کرنے کی ذمہ داری

نہیں ڈالی بلکہ اس کی ذمہ داری صرف اتنی قرار دی کہ اس نظام کو جسے
اللہ نے اس کے لیے مقرر فرما دیا، منطبق کرے۔ اس کے بعد کے سارے
کام اللہ نے انسانی عقل پر چھوڑ دیئے ہیں۔ یہ ایک وسیع میدان ہے۔
اللہ نے اس وسیع میدان کو انسان کے لیے جس طرح مسخر فرما دیا ہے
اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے عقل کو پوری آزادی حاصل ہے کہ نئی
راہیں تلاش کرے۔ ترمیمات کرے، اضافے عمل میں لائے اور جن
چیزوں کو مناسب سمجھے اس نظام زندگی میں جگہ دے (یہ سب اللہ
تعالے نے یہ جانتے ہوئے کیا ہے کہ) انسان کی عقل غلطی بھی کر سکتی ہے
اور صحیح راہ بھی اختیار کر سکتی ہے۔ اس کے قدم راہ حق پر قائم بھی رہ سکتے
ہیں اور اس سے دور بھی جا سکتے ہیں۔"

(فی ظلال القرآن جلد۲۔ پارہ ۶ صفحات ۲۵۔۳۵)

۸۔ انسانی عقل اس بات کی مجاز نہیں کہ وحی کے ذریعہ حاصل ہونے والی ہدایات
کو سمجھ لینے کے بعد ان کے صحیح یا غلط، مفید یا مضر ہونے کا فیصلہ کرے۔

"عقل اس بات کی مجاز نہیں ہے کہ نص کے صحیح مدلول کو باطل قرار
دے یا اس کے مطابق عمل نہ کرنے کا فیصلہ کرے۔ اس لیے کہ نص
اللہ کی طرف سے ہے اور عقل کوئی خدا نہیں کہ اس کے ٹھیک یا غلط
ہونے کا حکم لگائے، یا اسے قبول کرنے یا ترک کرنے کا فیصلہ کرے۔"

"اللہ سے ہدایت اخذ کرنے کا صحیح طریقہ یہ نہیں ہے کہ عقل
دین کے ثابت شدہ حقائق کو ٹھیک طور پر سمجھ لینے کے بعد ان کے

مقابلہ میں اپنی طرف سے پہلے سے طے کئے ہوئے کچھ حقائق لائے
جنہیں اس نے منطقی مقدمات سے ترتیب دیا ہو، یا جو اس کے محدود
مشاہدات اور ناقص تجربات کا نتیجہ ہوں۔۔۔۔۔۔ عقل خدا نہیں ہے
کہ اپنے بنائے ہوئے معیاروں کو اصول بنا کر اللہ کے دیئے ہوئے
اصولوں کو جانچے۔"

(فی ظلال القرآن جلد۲۔ پارہ ۶ صفحات ۲۵، ۳۵)

۹۔ مصنفؒ نے اس فکر سے بھی تعرض کیا ہے کہ کسی خاص زمانہ میں اللہ کا دین عملاً
"اللہ کے دین کا مفہوم جو انسان سمجھیں"، ہوتا ہے۔ چونکہ انسانی فہم اضافی اور تغیر پذیر واقع
ہوا ہے لہٰذا اللہ کا دین بھی مذکورہ بالا مفہوم میں، تغیر پذیر ہے۔ وہ اسے ایک خطرناک
فکر قرار دیتے ہیں جس کے درمیان" اور اس بات کے درمیان کہ دین انسانی ذہن
کی پیداوار ہے، بہت تھوڑا فاصلہ رہ جاتا ہے، اس لیے کہ دونوں کا آخری نتیجہ
ایک ہی ہے۔"

اس فکر کے خلاف ان کی دلیل یہ ہے کہ انسانی عقل کو ایک اٹل پیمانہ کی ضرورت
ہے۔" لازم ہے کہ اللہ کے دین کی کوئی مستقل حیثیت ہو جس کی طرف انسانی عقل،
دین کے مختلف مفہومات کو لے کر رجوع کر سکے۔ اسی طور پر یہ ممکن ہو گا کہ (عقل) ان
مفہومات کو اس اٹل پیمانہ سے جانچ سکے اور اس کے ذریعہ صحیح اور غلط میں تمیز کر سکے۔"

(فی ظلال القرآن جلد۴۔ پارہ ۱۱۔ صفحات ۱۱۱۔۱۱۴)

یہ ہے ان افکار کا خلاصہ جو آئندہ صفحات میں اپنے تفصیلی استدلال کے
ساتھ آپ کے سامنے آئیں گے۔ یہ دعویٰ نہیں کیا جا رہا ہے کہ مصنفؒ نے ان تمام

سوالات کے جوابات دے دیئے ہیں جن کا اوپر ذکر کیا گیا تھا، یا ان کا ہر جواب متعلقہ مسئلہ کو پوری طرح صاف کر دیتا ہے۔ چونکہ وہ قرآن اور سائنس یا وحی اور عقل پر ایک علیحدہ مستقل اور جامع بحث نہیں مرتب کر رہے تھے، بلکہ انھوں نے ان مسائل سے چند آیات قرآنی کی تفسیر کے ضمن میں بحث کی ہے لہٰذا ہمیں اس کی توقع بھی نہیں رکھنی چاہئے۔ ہمیں اس بات کا بھی شعور ہونا چاہئے کہ یہ سوالات بے حد نازک سوالات ہیں، اور ان کی نزاکت علم کی ترقی کے ساتھ بڑھتی جاتی ہے۔ جس بات پر ہم بڑی حد تک اطمینان ظاہر کر سکتے ہیں وہ یہ ہے کہ مصنف نے جو موقف اختیار کیا ہے وہ بہت واضح ہے اور ہمارے علم و اطلاع کی حد تک امت کے صاحب علم و بصیرت افراد کی غالب اکثریت ان امور کی بابت یہی موقف رکھتی ہے۔

البتہ ہمارے نزدیک بعض نکات پر مزید غور و بحث ضروری ہے مذکورہ بالا آخری نکتہ میں مصنفؒ نے جو رائے ظاہر کی ہے اس سے اختلاف نہیں کیا جا سکتا ہمیں ان کے اس احساس سے بھی کامل اتفاق ہے کہ فہم دین کے اضافی اور تغیر پذیر ہونے کو خود دین کے اضافی اور تغیر پذیر ہونے کی دلیل بنانا ایک ایسا رجحان ہے جو بالآخر دین کی سماوی حیثیت اور اس میں مخفی قوت نافذہ دونوں کو ختم کر دیتا ہے۔ البتہ اس بات کی بڑی اہمیت ہے کہ اس فکر کا تفصیلی تجزیہ کیا جائے، فلسفۂ لسانیات، علم تفسیر و تعبیر اور مذہبی کتابوں کے سمجھنے میں زبان فہمی کے اصولوں کے جدید استعمالات کا تنقیدی جائزہ لیا جائے اور جس استدلال کے ذریعہ یہ فکر اس خطرناک نتیجہ تک پہنچا ہے جس کی مصنفؒ نے نشاندہی کی ہے اس کی غلطی تفصیل کے ساتھ واضح کی جائے۔

پانچویں نکتہ پر بھی مزید روشنی ڈالنا ضروری ہے اور اس ضمن میں اٹھنے والے ذیلی سوالات علیحدہ سے توجہ کے طالب ہیں۔ چونکہ اس بارے میں بعض علماء اسلام نے مصنفؒ سے مختلف موقف اختیار کیا ہے اس لیے قرآن کریم کی متعلقہ آیات کی مختلف تفسیروں کو سامنے رکھ کر پورے مسئلہ کی تنقیح درکار ہے۔ قرآن کے کائناتی اشارے کس حد تک، چھٹی صدی عیسوی میں اہل عرب کی سائنٹفک معلومات پر مبنی، یا ان کی رعایات ملحوظ رکھنے والے واقع ہوئے ہیں، اہل عرب اگر ان امور سے متعلق بعض
یاان کی رعایت ملحوظ رکھنے والے واقع ہوئے ہیں اہل عرب اگر ان امور سے متعلق
بعض غلط فہمیوں میں مبتلا رہے ہوں تو قرآن ان امور سے کیونکر عہدہ برآ ہوا ہے، یہ بات صاف ہونی چاہئے۔ اسی طرح اس اجمال کی بھی تفصیل درکار ہے کہ بیسویں صدی تک سائنس نے جو ترقی کی ہے اس نے کس حد تک قرآن کے معانی کے ادراک میں وسعت پیدا کی ہے۔

مصنفؒ نے سائنس کے نظریات اور مشاہدہ و تجربہ پر مبنی سائنٹفک حقائق درمیان فرق کیا ہے حقیقت یہ ہے کہ مؤخر الذکر حقائق ہی انسان کے لیے دوسرے حقائق کے فہم و ادراک کا ذریعہ بنتے ہیں اور ان کے بارے میں کسی طرح کی بے اعتمادی یا شک کی کیفیت انسان کے اندر خود اپنے فہم و ادراک پر سے بھروسہ ختم کر دیتی ہے جس کے بعد وہ کسی بھی منبع سے یقینی علم نہیں حاصل کر سکتا۔

آئندہ صفحات میں پیش کیے جانے والے اقتباسات اور ان کی روشنی میں مرتب کیے ہوئے مذکورہ بالا نکات کا تعلق ایسے بنیادی سوالات سے ہے جو وحی و عقل، مذہب اور سائنس کے تعلق سے ہمیشہ سے سامنے آتے رہے ہیں اور ہمیشہ سامنے آتے رہیں گے۔ محدود انسانی عقل کے لامحدود علم و حکمت خداوندی

سے اکتساب فیض کے نازک اور دشوار عمل کا یہ مشکل مرحلہ ہمیشہ انسانی فہم وادراک اور اس کی قوتِ ایمانی کے لیے ایک چیلنج بنا رہے گا۔ علم کی ترقی اور مزاج کی تبدیلی کے ساتھ انسان پرانے سوالات کو نئے انداز سے دہراتا ہے اور مزاج عصر کے مطابق نئی زبان اور نئے پیرایۂ بیان میں ان کے جوابات مرتب کرکے اپنی تشفی کا سامان فراہم کرتا ہے۔ یہ عمل جاری ہے اور ہمیشہ جاری رہے گا۔ سید قطبؒ کے پیش نگاہ افادات اس مسلسل کدوکاوش میں ہماری مدد کرتے ہیں۔ اس باب میں کوئی وضاحت حرف آخر کا درجہ نہیں رکھتی مگر ہمیں امید ہے کہ مصنفؒ کی تحریر ہمارے فکر میں مزید پختگی اور فہم میں مزید جلا پیدا کر سکے گی۔

اللہ تعالےٰ مصنفؒ کو ان کی کوشش کی جزائے خیر دے اور ہمیں وہ حکمت و بصیرت عطا کرے جو اس کتاب اور اس کی کائنات کے ایک دوسرے سے مربوط اور ہم آہنگ فہم میں ہماری رہنمائی کر سکے۔ آمین۔

مسلم یونیورسٹی۔ علی گڈھ　　　　محمد نجات اللہ صدیقی

۲ ربیع الاول ۱۳۹۵ھ

۱۶ مارچ ۱۹۷۵ء

آیات قرآنی

اور سائنسی انکشافات

یَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الْاَهِلَّةِ ۔ قُلْ هِیَ مَوَاقِیْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ

لوگ تم سے چاند کی گھٹتی بڑھتی صورتوں کے متعلق پوچھتے ہیں کہو یہ لوگوں کے لیے تاریخوں کی تعیین اور حج کی علامتیں ہیں۔ (بقرہ: ۱۸۹)

بعض روایات میں آیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلی تاریخ کے چاند کے بارے میں مذکورہ بالا سوال کیا گیا تھا کہ اس کے نمودار ہونے بڑا ہوتے جانے اور پھر گھٹنے کا راز کیا ہے۔ بعض دوسری روایات میں آیا ہے کہ لوگوں نے دریافت کیا تھا کہ اے اللہ کے رسول پہلی تاریخ کا چاند کس لیے بنایا گیا ہے؟ سوال کا یہ دوسرا پیرایہ غالباً جواب کے مزاج سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالےٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا کہ:

لہ :۔ فی ظلال القرآن۔ پانچواں ایڈیشن ۱۹۶۷ء جلد ۱۔ پارہ ۲۔ صفحات ۹۴-۹۹

قُلْ هِيَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ

کہہ دیجئے۔ یہ لوگوں کے لیے تاریخوں کی تعیین اور حج کی علامتیں ہیں۔ (البقرہ ۱۸۹)
لوگوں کے لیے احرام باندھنے اور کھولنے کے وقت کی تعیین کے لیے نیز روزہ رکھنے اور روزہ ختم کرنے نکاح، طلاق اور عدت میں اور دوسرے معاملات تجارت اور لین دین میں مدتوں کی تعیین کے لیے نیز دوسرے دینی اور دنیوی امور میں بھی (تعیین اوقات کے لیے)

خواہ یہ جواب پہلے سوال کا ہو یا دوسرے سوال کا، دونوں صورتوں میں اس کا رُخ خالص نظری علم کی طرف نہیں بلکہ ان لوگوں کی عملی زندگی کی طرف ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ بتایا کہ پہلی تاریخ کا چاند ان لوگوں کی روزمرہ زندگی میں کس کام آتا ہے چاند کے فلکی ادوار نہیں بیان کیے نہ یہ بتایا کہ پہلی تاریخ کا چاند کس طرح پورا چاند بن جاتا ہے حالانکہ یہ بات ان کے اس سوال کے مفہوم میں داخل تھی کہ پورے چاند کے ہلال میں تبدیل ہونے کا راز کیا ہے؟ اسی طرح یہ نہیں بتایا کہ نظام شمسی میں اور اجرام سماوی کی حرکت اور ان کے درمیان توازن میں چاند کا کیا مقام ہے۔ اگرچہ یہ بات اس سوال میں شامل تھی کہ اللہ تعالیٰ نے پہلی تاریخ کا چاند کس لیے بنایا ہے اب سوال یہ ہے کہ جواب دینے کا یہ انداز ہمارے لیے کیا رہنمائی فراہم کرتا ہے؟

قرآن ایک مخصوص تصور، ایک مخصوص نظام اور ایک مخصوص سماج پیدا کرنا چاہتا تھا وہ زمین میں ایک نئی امت برپا کرنے آیا تھا جسے انسانیت کی رہنمائی کا ایک خاص کردار ادا کرنا تھا تاکہ یہ امت سماج کا ایک مخصوص نمونہ پیش کرے جو اس سے پہلے کبھی نہیں پیش کیا جا سکا تھا اور ایک ایسی زندگی گذار کر دکھا جائے جو اس

سے پہلے کبھی نہیں گذاری گئی تھی اور اس طرح اس طرز زندگی کے اصول زمین میں قائم کر جائے اور انسانوں کو اس کی طرف لے آئے۔

ہو سکتا ہے کہ اس سوال کا 'سائنٹفک' جواب دریافت کرنے والوں کو فلکیات کا نظری علم عطا کر دیا جاتا بشرطیکہ ان تھوڑی معلومات کے باوجود جو انھیں اس زمانے میں میسر تھیں، ان کے لیے اس علم کا پوری طرح سمجھ لینا ممکن بھی ہوتا۔ اس میں بہت شبہ ہے کہ ان کے لیے ایسا ممکن ہوتا کیونکہ اس طرح کا نظری علم بہت لمبے چوڑے مقدمات کا محتاج ہوتا ہے جو اس زمانہ کی پوری دنیا کی عقل و فہم کی نسبت سے سخت دشوار قرار دیے جا سکتے ہیں یہی وجہ ہے کہ قرآن نے ایسا جواب دینے سے گریز کیا جس کے سمجھنے کی صلاحیت انسانوں میں نہیں پائی جاتی تھی اور جو اس اولین کام کے لیے کوئی زیادہ مفید بھی نہ ہوتا جس کے لیے قرآن آیا تھا۔ اور یہ تو بہرصورت واضح ہے کہ ایسے جوابات کی مناسب جگہ قرآن نہیں ہے۔ کیونکہ قرآن ان جزئی معلومات سے کہیں زیادہ بڑی چیز کی خاطر آیا ہے۔ قرآن فلکیات، کیمیا یا طب کی سائنس کی کتاب بننے کے لیے نہیں آیا ہے .... مگر قرآن کے بعض پرجوش حامی کوشش کرتے ہیں کہ اس کے اندر یہ علوم تلاش کریں، اور دوسری طرف اس کے بعض نکتہ چین اس میں ان علوم کے خلاف باتوں کی ٹوہ میں رہتے ہیں۔

یہ دونوں کوششیں اس کتاب کا مزاج، اس کا کردار اور اس کا میدانِ عمل نہ سمجھ سکنے کی دلیل ہیں۔ اس کا میدان نفس انسانی اور حیاتِ انسانی ہے۔ قرآن کا کام یہ ہے کہ کائنات کا ایک عمومی تصور عطا کرے اور اس کے خالق سے اس کا تعلق واضح کر دے۔ یہ بتائے کہ کائنات میں انسان کا مقام کیا ہے اور اس کا اپنے

رب سے کیا تعلق ہے۔ اس تصور کی بنیاد پر وہ زندگی کا ایک ایسا نظام قائم کرنا چاہتا ہے جو انسان کو اپنی تمام قوتوں کے استعمال کا پورا موقع عطا کرے۔ انہی قوتوں میں سے انسان کی ایک قوت عقلی ہے جو صحیح طور پر پروان چڑھانے اور سائنٹفک تحقیق، تجربہ اور تطبیق کے ذریعے، ان حدود کے اندر جن میں انسانی کوششیں ممکن ہیں آزادانہ کام کا موقع پانے کے بعد سرگرم عمل ہوتی ہے اور جن نتائج تک بھی پہونچ سکتی ہے پہنچتی ہے۔ قدرتی طور پر یہ نتائج نہ تو آخری ہوتے ہیں نہ مطلق۔

قرآن کا موضوع خود انسان ہے۔ اس کا تصور و اعتقاد، اس کا شعور و ادراک، اس کا رویہ اور طرز عمل اور اس کے تعلقات و روابط ...... جہاں تک مادی علوم اور مختلف قسم کے وسائل کو کام میں لاتے ہوئے مادی ایجادات عمل میں لانے کا تعلق ہے، یہ کام انسان کی عقل و تجربہ اس کے اکتشافات، اس کے مفروضات Hypotheses اور اس کے نظریات Theories کے سپرد ہے۔ کیونکہ یہی زمین میں انسان کی خلافت کی بنیاد ہیں اور انسان اپنی عین خلقت کے اعتبار سے انہی کاموں کے لیے بنایا گیا ہے۔ قرآن تو انسان کی فطرت کو درست کرتا اور درست رکھتا ہے تاکہ وہ انحراف کا شکار ہو کر فساد نہ برپا کرے۔ وہ اس نظام کی اصلاح کرتا ہے جس کے تحت انسان زندگی گزارتا ہے تاکہ یہ نظام انسان کو ان قوتوں کے استعمال کا پورا موقع دے، جو اسے عطا ہوئی ہیں۔ زاد راہ کے طور پر قرآن انسان کو کائنات کے مزاج، اس کے خالق سے اس کے ربط، اس کے نظام کی ہم آہنگی اور اس کے مختلف اجزاء کے درمیان جن میں سے ایک جز، خود انسان بھی ہے، پائے جانے والے ربط کا عمومی تصور عطا کرتا ہے۔ اس کے بعد وہ اسے جزئیات کا علم حاصل کرنے

کی کوشش اور اپنے کار خلافت میں اس علم سے فائدہ اٹھانے کے لیے آزاد چھوڑ دیتا ہے۔ وہ اسے یہ تفصیلات خود نہیں فراہم کرتا کیونکہ ان تفصیلات کی دریافت خود انسان کے اپنے مخصوص کام کا ایک جزء ہے۔

مجھے قرآن کے ان پرجوش حامیوں کی سادہ لوحی پر حیرت ہے جو اس کی طرف ایسی بات منسوب کرنا چاہتے ہیں جو اس کے دائرے سے خارج ہے اور اس پر ایسی ذمہ داری ڈالنا چاہتے ہیں جو اس کو مقصود نہیں۔ یہ لوگ اس میں سے طب، کیمیا اور فلکیات وغیرہ کی جزئیات نکالنا چاہتے ہیں، گویا کہ اس طرح وہ اس کی عظمت و بلندی ثابت کرسکیں گے۔

حقیقت یہ ہے کہ قرآن اپنے موضوع پر ایک مکمل کتاب ہے۔ اور اس کا موضوع مذکورہ بالا تمام علوم سے زیادہ اہم ہے۔ کیونکہ یہ موضوع خود وہ انسان ہے جو یہ سارے علوم دریافت کرتا اور ان سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ تفتیش و تجربہ اور تطبیق انسان کی عقل کے خواص میں سے ہیں۔ قرآن خود اس انسان کی تعمیر اپنے ہاتھ میں لیتا ہے۔ وہ اس کی شخصیت اس کے ضمیر، اس کی عقل اور اس کے فکر کو بناتا ہے۔ ساتھ ہی وہ انسانی سماج کی تشکیل عمل میں لاتا ہے جو اس انسان کو اس کے اندر ودیعت کردہ ان قوتوں کو سلیقے کے ساتھ استعمال کرنے کا پورا پورا موقع دے۔ صحیح تصور اور صالح فکر و شعور رکھنے والے انسان کو، نیز ایک ایسے معاشرے کو وجود میں لانے کے بعد جو انسان کو سرگرمی عمل کا پورا موقع دے۔ قرآن انسان کو تفتیش و تجربے کے لیے آزاد چھوڑ دیتا ہے اب وہ علم اور تفتیش و تجربے کے میدان میں غلطی بھی کرسکتا ہے اور صحیح نتائج تک بھی پہنچ سکتا ہے قرآن نے اس کے لیے صحیح غور و فکر اور تصور آرائی کے پیمانے البتہ مقرر

کر دیتے ہیں۔

یہ بات درست نہ ہوگی کہ کائنات کے بارے میں جن آخری حقائق کا ذکر قرآن کائنات کے مزاج، اس کے خالق سے اس کے تعلق اور اجزائے کائنات کے درمیان باہمی ربط واضح کرنے کے دوران میں کبھی کبھی کرتا ہے ان کو ہم انسانی عقل کے قائم کردہ مفروضات Hypotheses اور نظریات Theories کا پابند بنا دیں۔ یہ طریقہ تو ہمیں ان سائنٹفک حقائق Scientific Facts کے سلسلے میں بھی نہیں اختیار کرنا چاہیے جن تک انسان اپنی دانست میں تجربے کے قطعی طریقے سے پہنچتا ہے۔ قرآن کے حقائق آخری قطعی اور مطلق حقائق ہیں۔ انسانی تحقیق جو حقائق دریافت کرتی ہے، قطع نظر اس کے کہ اس تحقیق کے ذرائع کیا ہیں، وہ نہ آخری ہوتے ہیں نہ قطعی۔ یہ حقائق ان حدود کے اندر ہی درست ہوتے ہیں جن کے اندر انسانی تجربہ کیا جاتا ہے، جن حالات میں یہ تجربات کیے گئے ہوں اور جن آلات و ذرائع سے ان میں کام لیا گیا ہو وہ بھی ان کی حدیں مقرر کرتے ہیں۔ لہٰذا انسان کے اپنے سائنٹفک طریقہ تحقیق کی روشنی میں یہ طریقہ اختیار کرنا غلط ہوگا کہ ہم قرآن کے آخری حقائق کو ایسے حقائق پر معلق کر دیں جو آخری نہیں ہیں۔ انسان کی رسائی بس ایسے ہی حقائق تک ممکن ہے۔

یہ تو سائنٹفک حقائق کا معاملہ تھا۔ جہاں تک ان مفروضات و نظریات کا سوال ہے جنہیں سائنٹفک کہا جاتا ہے، بات زیادہ واضح ہے۔ فلکیات کے جملہ نظریات انسان کے ظہور اور اس کے مختلف مراحل سے متعلق نظریات، انسانی نفسیات اور اس کے رویے کے بارے میں تمام نظریات اور سماج کی تشکیل اور اس کے مختلف

ادوار کے سلسلے میں پیش کیے جانے والے نظریات کا یہی حال ہے کہ یہ خود انسان کے نزدیک "سائنٹفک حقائق" نہیں ہیں بلکہ نظریات یا مفروضات ہیں۔ ان کی تمام قدر و قیمت اس میں مضمر ہے کہ یہ کائنات، حیات، نفسیات اور سماج کے بہت سے مظاہر کی توجیہہ و تشریح کے لیے موزوں پائے جا رہے ہیں۔ تا آنکہ کوئی دوسرا مفروضہ Hypotheses مرتب کیا جا سکے جو نسبتہً زیادہ مظاہر کی توجیہہ و تعبیر کر سکے یا نسبتہً زیادہ گہری توجیہہ و تشریح کر سکے۔ معلوم ہوا کہ ان نظریات میں ترمیم و تبدیلی اور کمی بیشی ہمیشہ ممکن ہے۔ بلکہ یہ بھی ممکن ہے کہ کسی نئے ذریعۂ تفتیش کی ایجاد کے سبب یا قدیم مشاہدات کی کسی نئی تعبیر کے سامنے آجانے کی وجہ سے کوئی نظریہ یا مفروضہ بالکل الٹ جائے۔

قرآن کے عام اشارات کو سائنس کے نت نئے اور بدلتے رہنے والے نظریات سے جوڑنے کی ہر کوشش، بلکہ ان کو ان سائنٹفک حقائق سے جوڑنا بھی جن کے بارے میں ہم اوپر بتا چکے ہیں کہ وہ مطلق نہیں ہوتے۔ اولاً تو منہاج Meth od کے اعتبار سے غلط ہیں۔ مزید برآں اس طریق کار کے تین پہلو اور بھی ہیں جو قرآن کے مقام بلند سے کسی طرح مناسبت نہیں رکھتے۔

ا[illegible] یہ داخلی شکست خوردگی ہے جو بعض لوگوں کو اس گمان میں مبتلا کیے ہوئے ہے کہ اصل چیز سائنس ہے۔ اور قرآن کا کام اس کے پیچھے چلنا ہے۔ لہٰذا وہ سائنس کے ذریعے قرآن کو قوت بخشنا چاہتے ہیں یا سائنس سے قرآن کے حق میں دلیل فراہم کرنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ قرآن اپنے موضوع پر ایک مکمل کتاب ہے اور وہ جو حقائق بیان کرتا ہے وہ آخری حقائق ہیں۔ سائنس کا اپنے موضوع میں

یہ حال ہے کہ وہ کل جس بات کو ثابت کر چکی ہے اسے آج رد کر دیتی ہے اور جن حقائق کو وہ دریافت کرتی ہے وہ نہ آخری ہوتے ہیں نہ مطلق۔ کیونکہ سائنس کا واسطہ انسان، اس کی عقل اور اس کے ذرائع و آلات ہیں جن کی ماہیت ہی ایسی ہے کہ وہ ایک بھی آخری اور مطلق حقیقت نہیں عطا کر سکتے۔

۲۔ قرآن کے مزاج اور اس کے کام کی نوعیت کو ٹھیک طرح نہ سمجھ سکنا یعنی یہ بات نہ سمجھ سکنا کہ قرآن آخری اور مطلق حقیقت ہے جس کا مشن انسان کی ایسی تعمیر ہے جو جس حد تک انسان کا اپنا مزاج اس بات کی اجازت دے کائنات اور قوانین الٰہی سے ہم آہنگ ہو تاکہ انسان اپنے چار طرف پھیلی ہوئی کائنات سے ٹکرائے نہیں بلکہ اس کا دوست بن کر رہے، اس کے بعض رازوں سے واقف ہو جائے اور اس کے بعض قوانین کو اپنے کار خلافت میں استعمال کرے۔

یہ قوانین فطرت انسان کو غور و فکر، تحقیق اور تجربہ و تطبیق کے ذریعے اس حد تک معلوم ہوتے ہیں جس حد تک اس کی خداداد عقل جا سکتی ہے۔ وہ عقل جو اسی لیے دی گئی کہ اس سے کام لیا جائے نہ صرف اس لیے کہ جو مادی معلومات بالکل عیاں ہو کر سامنے آجائیں ان کو مان لے اور بس!

۳۔ (اس طریق کار کا تیسرا پہلو اور اس کا تقاضا یہ ہے کہ) نصوص قرآنی کی قدرے تکلف اور حیلہ کے ساتھ ہر بار نئی تاویل کی جائے۔ تاکہ ہم ان نظریات اور مفروضات سے ان کی مطابقت ثابت کر سکیں جو ناپائدار اور بدلتے رہنے والے واقع ہوئے ہیں اور جن میں ہر آن نئی باتوں کا اضافہ ہوتا ہے۔

یہ باتیں قرآن کے شایان شان نہیں اور جیسا کہ ہم نے پہلے لکھا ہے، یہ

طریقہ بطور طریقہ کے بھی غلط ہے۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ سائنس کائنات، حیات، اور انسان کے بارے میں جو نظریات اور حقائق سامنے لائے ان سے ہم قرآن کے فہم میں کوئی فائدہ نہ اٹھائیں ہرگز نہیں۔ مذکورہ باتوں سے ہمارا یہ منشا ہرگز نہیں تھا اور ہو بھی کیسے سکتا ہے جب کہ اللہ سبحانہٗ خود فرماتا ہے کہ:۔

سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ ؕ

عنقریب ہم ان کو اپنی نشانیاں آفاق میں بھی دکھائیں گے اور ان کے اپنے نفس میں بھی۔ یہاں تک کہ ان پر یہ بات کھل جائے کہ یہ قرآن واقعی برحق ہے۔

(حٰم السجدہ، ۵۳)

اس اشارہ کا تقاضا ہے کہ سائنس آفاق و انفس میں اللہ کی جو نشانیاں بھی دریافت کر سکے ہم ان پر مسلسل غور و فکر کرتے رہیں اور اپنے فکر میں قرآن کے معانی کو ان علمی اکتشافات کے مطابق وسیع تر کرتے رہیں۔

یہ کام کیسے کیا جائے؟ بالخصوص ایسی صورت میں جب کہ ہم قرآن کے آخری مطلق نصوص کو ایسے معانی کا پابند نہیں بنانا چاہتے جو نہ آخری ہوتے ہیں نہ مطلق؟ اس سوال کا جواب بعض مثالوں کے ذریعہ دینا مفید ہو گا۔

وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهُ تَقْدِيرًا

اور اس نے ہر چیز کو پیدا کیا پھر اسے ایک خاص اندازہ پر رکھا۔

(فرقان ۲)

اب سائنٹفک تحقیقات یہ انکشاف کرتی ہیں کہ اس کائنات میں بڑی باریکی کے ساتھ ہم آہنگی اور نظم کا اہتمام پایا جاتا ہے۔ زمین کی یہ مخصوص شکل، سورج کا اس سے اس قدر فاصلہ پر ہونا، چاند کا اس سے ایک مخصوص فاصلے پر واقع ہونا، سورج اور زمین اور چاند اور زمین کے حجم کے درمیان مخصوص نسبتوں کا پایا جانا، زمین کی حرکت کی یہ مخصوص رفتار، پھر اس کا ایک محور پر ایک خاص حد تک جھکا ہوا ہونا، اس کی بالائی سطح کی یہ مخصوص نوعیت اور اسی طرح کی ہزاروں خصوصیات جو زمین کو زندگی کے لیے سازگار اور موزوں بنائے ہوئے ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی چیز نہ ایک عارضی حادثہ ہو سکتی ہے۔ نہ ایسا اتفاقی امر قرار دی جا سکتی ہے جس کے پیچھے کوئی مقصد نہ ہو۔ یہ تحقیقات " وخلق کل شیی فقدرہ تقدیرا " کے معانی میں وسعت پیدا کرتی اور ہمارے فکر کے اندر اس کے مفہوم میں گہرائی پیدا کرتی ہیں اس میں کوئی حرج نہیں کہ مفہوم کی گہرائی اور معانی کی وسعت کی خاطر ان جیسی معلومات کا احاطہ کیا جائے۔ ایسا کرنا درست بھی ہے اور مطلوب بھی ہے۔ مگر جو چیز نہ تو جائز ہے، نہ علمی اعتبار سے درست قرار دی جا سکتی ہے وہ وہ باتیں ہیں جو حسب ذیل مثالوں کے ذریعے سامنے آتی ہیں، قرآن کریم فرماتا ہے:۔

خلقنا الانسان من سلالة من طین (مومنون ۱۲)

ہم نے انسان کو مٹی کے جوہر سے بنایا۔

پھر والاس اور ڈارون کا نظریہ نشوو ارتقا سامنے آتا ہے جو یہ مفروضہ قائم کرتا ہے کہ زندگی ایک خلیہ کی صورت میں شروع ہوئی، اور یہ خلیہ پانی میں پیدا ہوا اور پروان چڑھا پھر یہی خلیہ مختلف مراحل سے گذر کر بالآخر انسان کی تخلیق پر منتج ہوا۔ اب

ہم اس نص قرآنی کو لے کر اس نظریے کے پیچھے لپکنے لگے تا کہ یہ کہہ سکیں کہ یہی قرآن نے بھی کہا ہے۔

نہیں ——— پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ نظریہ آخری نہیں۔ کیونکہ ایک صدی سے کم مدت میں بھی اس میں اتنی ترمیمیں ہوئی ہیں جنھوں نے اسے تقریباً یکسر بدل کر رکھ دیا ہے۔ وراثت کی اکائیوں Genes کے بارے میں، جو ہر نوع کی خصوصیات کی حامل ہوتی ہیں اور ایک نوع کے دوسرے میں تبدیل ہونے میں مانع ہوتی ہیں، ناقص معلومات پر مبنی ہونے کے سبب اس نظریے میں ایک ایسی کمزوری ہو چکی ہے جو اس کو تقریباً غلط ٹھہرا دیتی ہے۔ اس کا امکان بہر حال ہے کہ کل کو یہ غلط ثابت ہو جائے اور رد کر دیا جائے۔ دوسری طرف قرآن کی بیان کردہ حقیقت آخری ہے۔ یہ بھی ضروری نہیں کہ اس کے معنے یہی ہوں آیت صرف انسان کے آغاز کی بنیاد بتاتی ہے۔ اس آغاز کی تفصیلی کیفیت نہیں بیان کرتی۔ وہ صرف ایک بات کی حد تک آخری ہے جو اسے بیان کرنا مقصود ہے، یعنی یہ کہ انسان کی اٹھان کہاں سے ہوئی۔ بس، اس سے زیادہ کچھ نہیں۔

قرآن کریم کہتا ہے:

"والشمس تجری لمستقرلها"

اس بیان سے وہ سورج کے بارے میں ایک آخری حقیقت سامنے لاتا ہے۔ یعنی یہ کہ سورج حرکت کرتا ہے۔ سائنس کہتی ہے کہ سورج اپنے گرد کے ستاروں کی نسبت سے تقریباً بارہ میل فی سکنڈ کی رفتار سے حرکت کر رہا ہے لیکن وہ جس کہکشاں کا ایک ستارہ ہے۔ اس پوری کہکشاں سمیت ایک سو ستر میل فی سکنڈ کی رفتار سے

حرکت کررہا ہے۔ لیکن فلکیات کی یہ تحقیق آیتِ قرآن کا عین مطلب نہیں قرار دی جاسکتی
یہ اضافی حقیقتوں کا بیان ہے جو آخری نہیں اور قابل ترمیم و تردید ہیں۔ آیت قرآنی
ہمیں صرف ایک آخری حقیقت بتاتی ہے کہ سورج حرکت کرتا ہے۔ بس ہم اس حقیقت
کو مذکورہ بالا تحقیقات کا پابند ہرگز نہیں بنائیں گے ——— قرآن حکیم کہتا ہے :۔

اَوَلَمْ یَرَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْٓا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ کَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا۔

کیا وہ لوگ جنھوں نے (نبی کی بات ماننے سے) انکار کردیا ہے غور نہیں
کرتے کہ یہ سب آسمان اور زمین باہم ملے ہوئے تھے۔ پھر ہم نے انھیں
جدا کیا۔ (انبیاء : ۳۰)

پھر ایک نظریہ سامنے آتا ہے جو کہتا ہے کہ زمین سورج ہی کا ایک ٹکڑا تھی۔ جو
اس سے الگ ہوگیا ہے۔ اب ہم قرآن کی اس نص کو لے کر دوڑ پڑتے ہیں تاکہ
سائنس کے اس نظریے کو اختیار کرکے یہ کہہ سکیں کہ یہی بات آیت قرآنی میں بھی کہی
گئی ہے۔

نہیں ——— آیت کا مطلب بعینہٖ یہ نہیں ہے۔ کیونکہ یہ ایک نظریہ ہے۔ جو
آخری نہیں ہے۔ زمین کے آغاز کے بارے میں سائنٹفک ثبوت کے اعتبار سے اسی
پایہ کے دوسرے نظریات بھی موجود ہیں۔ جہاں تک حقیقت قرآنی کا سوال ہے وہ
آخری اور مطلق ہے اور وہ صرف اتنا متعین کردیتی ہے کہ زمین آسمان سے الگ
ہوئی ہے۔ کیسے؟ وہ آسمان کیا چیز ہے جس سے وہ الگ ہوئی ہے۔ ان باتوں سے
آیت کوئی تعرض نہیں کرتی۔ اسی لیے یہ جائز نہیں ہوگا کہ اس مسئلے کے بارے میں

کسی ایک سائنٹفک مفروضے کے حق میں یہ کہا جائے کہ وہی آیت کا آخری مفہوم ہے۔

یہاں یہی چند مثالیں کافی ہوں گی۔ کیونکہ ہمارا منشا یہ واضح کرنا تھا کہ سائنٹفک
انکشافات سے آیات قرآنی کے معانی میں گہرائی اور وسعتیں پیدا کرنے کا فائدہ اٹھانے
کا صحیح طریقہ کیا ہوگا۔ بغیر اس کے کہ آیت کو کسی مخصوص نظریہ یا سائنٹفک حقیقت سے
جوڑ کر اس سے اس کی مطابقت ثابت کی جائے۔ یا اس سے اس کی صحت اور درستی
ثابت کی جائے۔ ان دونوں طریقوں کے درمیان بڑا فرق ہے۔

علم کا حقیقی سرچشمہ

سائنسی اکتشافات نہیں، وحی و رسالت

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ؁

وہ رسول (جو ہماری طرف سے انسانوں کی ہدایت پر مامور ہوئے) ہم نے
ان کو ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر مرتبے عطا کیے۔ (البقرہ: ۲۵۳)

اس گفتگو میں سب سے پہلے جو چیز ہمارے سامنے آتی ہے وہ تعبیر کا وہ خاص انداز ہے جسے رسولوں کے سلسلے میں اختیار کیا گیا ہے: کہا گیا: "وہ رسول"، یہ نہیں کہا گیا: "یہ رسول" ان کے متعلق گفتگو اس خاص انداز بیان سے شروع کی گئی ہے جو ایک نمایاں اور جاندار مفہوم کی حامل ہے۔ بہتر معلوم ہوتا ہے کہ اس گفتگو کے دیگر مضمرات پر غور کرنے سے پہلے ہم اس کے متعلق کچھ عرض کر دیں۔

"وہ رسول" یہ ایک مخصوص گروہ ہے جو اگرچہ اور انسانوں کی طرح انسان ہیں

؁: فی ظلال القرآن۔ پانچواں ایڈیشن ۱۹۶۷ء، جلد ا۔ پارہ ۳ صفحات ۹-۱۵۔

لیکن مخصوص مزاج کے حامل ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ کون لوگ ہیں؟۔ رسالت کیا ہے؟ اس کا مزاج کیا ہے؟ یہ کیسے مکمل ہوتی ہے؟ تنہا یہی لوگ کیوں پیغمبر بنائے گئے اور کیا پیغام دے کر بھیجے گئے؟۔

یہ وہ سوالات ہیں کہ عرصے سے میں ان کا جواب تلاش کرنے سے کتراتا رہا۔ میرا احساس جذبات و معانی کے سمندر سے لبریز ہے جن کی ادائیگی سے الفاظ قاصر ہیں لیکن بہرحال جذبات و معانی کی ادائیگی کے لیے الفاظ ہی کا سہارا لینا پڑتا ہے۔

یہ کائنات جس کے اندر ہم زندگی بسر کر رہے ہیں اور جس کا ہم ایک جزء ہیں اس کے اندر چند پائیدار اصول کارفرما ہیں جن پر اس کی بنیاد قائم ہے۔ یہ اصول کائنات کے وہ قوانین ہیں جنھیں اللہ نے اس کے اندر ودیعت کیا ہے تاکہ وہ ان کے مطابق چلے ان کے اقتضا کے لحاظ سے حرکت کرے اور ان کے تقاضوں کے مطابق عمل کرے۔

انسان جب علم و معرفت کی راہ میں آگے بڑھتا ہے تو انہی قوانین کے بعض گوشوں کا پتہ لگاتا ہے۔ وہ اپنے محدود ادراک کی مناسبت سے کسی حد تک انھیں بے نقاب کرتا ہے یا انھیں اس کے لیے بے نقاب کر دیا جاتا ہے۔ کسی محدود مدت میں اسے اسی قدر ادراک عطا کیا جاتا ہے جو اس زمین میں بار خلافت اٹھانے کے لیے ناگزیر ہوتا ہے۔

انسان کائنات کے قوانین کے ان گوشوں کا پتہ لگانے کے لیے اپنے دو بنیادی وسائل پر اعتماد کرتا ہے یعنی مشاہدہ و تجربہ۔ یہ دونوں وسائل اپنی نوعیت کے اعتبار سے جزئی ہیں یہ نہ آخری ہیں اور نہ اپنے نتائج کے اعتبار سے مطلق۔ اگرچہ مدتہائے دراز میں بسا اوقات یہ کلی قوانین کے بعض گوشوں کی طرف رہنمائی کر

دیتے ہیں۔ لیکن پھر یہ انکشاف جزئی صداقت کا حامل بن کر رہ جاتا ہے۔ نہ آخری ہوتا ہے اور نہ مطلق۔ اس لیے کہ ان قوانین کے مابین ہم آہنگی کا راز قدرت کا وہی راز ہے جو دوسرے جملہ قوانین میں ہم آہنگی پیدا کرتا ہے۔ یہ راز برابر پوشیدہ رہتا ہے۔ جزئی اور اضافی مشاہدہ اس تک پہونچ نہیں سکتا۔ خواہ کتنا ہی زمانہ گذر جائے۔ یقیناً اس سیاق میں زمانہ فیصلہ کن عنصر نہیں ہے یہ تو محض ایک حد کا نام ہے جو انسان کے لیے مقرر کردی گئی ہے، تکوینی طور پر اور کائنات میں اپنے دور کے لحاظ سے، یہ دور جزئی اور اضافی ہے۔ پھر اسی طرح زمین پر پوری نوع انسانی کو جو مدت ملی ہے وہ بھی اپنے دور کے لحاظ سے جزئی اور محدود ہے۔ اسی طرح علم و معرفت کے تمام وسائل اور وہ تمام نتائج جن تک انسان ان وسائل کے ذریعہ پہونچتا ہے۔ اس جزئی اور اضافی دائرے میں محصور ہو کے رہ جاتے ہیں۔

یہیں سے رسالت کا رول شروع ہوتا ہے۔ اس مخصوص فطرت کا کردار جسے اللہ تعالےٰ نے اپنی طرف سے ایک مخصوص استعداد عطا کی ہے تاکہ وہ اس ناموسِ کلی، کے ساتھ جس پر کائنات کا وجود مبنی ہے، گہرائیوں میں جا کر تعامل کر سکے۔ یہ عمل ایک ایسے طریقے سے انجام پاتا ہے جس کی حقیقت سے ہم یکسر ناواقف ہیں۔ اگرچہ اس کے آثار و نتائج کا ادراک کر لیتے ہیں۔

یہی مخصوص فطرت ہے جو وحی سے دوچار ہوتی ہے اور چونکہ اسے وحی سے اخذ کرنے کے لیے تیار کیا گیا ہوتا ہے اس لیے اسے قبول کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے اس لیے کہ وہ براہ راست اس 'ناموس کائنات' سے ملی ہوتی ہے جو اس کائنات میں تصرف کررہی ہے۔ یہ اس اشارے کو کیسے حاصل کرتی ہے؟ اور کن آلات و

وسائل سے اخذ کرتی ہے؟ اس سوال کا جواب دینے کے لیے ضروری ہے کہ ہمیں بھی یہی فطرت ملی ہو جسے اللہ تعالےٰ اپنے بندوں میں سے منتخب لوگوں کو عطا فرماتا ہے۔ اللہ خوب جانتا ہے کہ اپنا منصب رسالت کس کو عطا کرے۔ یہ ایک عظیم معاملہ ہے اور عالم میں پائے جانے والے ان تمام رازوں سے عظیم تر ہے جن کا انسان کے دل میں خیال آتا ہے۔

تمام رسولوں نے 'توحید' کی حقیقت کو پالیا تھا اور سب کو اسی کا پیغام دے کر بھیجا گیا تھا۔ ایسا اس لیے ہے کہ ان تمام کی سرشت میں ایک ہی 'ناموس' کے القاء کیے جانے نے، انھیں اس کے مصدرِ وحید کی طرف رہنمائی کر دی تھی جو متعدد نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اگر یہ متعدد ہوتا تو ناموس بھی کئی ہوتے اور وہ القاءات بھی کئی طرح کے ہوتے جنھیں یہ اخذ کرتے ہیں (انبیاء کو) اس حقیقت کا ادراک انسانی تاریخ کے آغاز ہی میں ہو گیا تھا جب کہ ابھی وہ خارجی علوم نمود پذیر نہیں ہوئے تھے، جن کی بنیاد تجربہ و مشاہدہ پر ہوتی ہے، اور جب کہ ابھی کائنات کے ان بعض قوانین کا انکشاف بھی نہیں ہوا تھا جو اس وحدت کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

ان تمام رسولوں نے ایک اللہ کی عبادت کی طرف دعوت دی یعنی اس حقیقت کی طرف جو انھیں حاصل ہوئی تھی اور جسے پہنچانے کا انھیں حکم دیا گیا تھا۔ ان کا اس حقیقت کو پالینا فطرت کا وہ بول تھا جو اپنے رب سے جا ملنے والی فطرت میں اس واحد ناموس کے القاء کے نتیجے میں پیدا ہوتا ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح کہ ان کا اس کی تبلیغ کے لیے اٹھ کھڑا ہونا فطری نتیجہ تھا ان کے اس کامل ایمان کا کہ یہی دراصل حقیقت ہے اور اس لیے کہ اس کا صدور اس خدائے واحد کی طرف سے

ہوا ہے جو — ان کے اس سچے قول اور پابندکن افکار کے مطابق جسے ان کی فطرت نے اخذ کیا تھا ——— متعدد نہیں ہو سکتا۔

اس حقیقت کی یہ طاقتور اور پابندکن کیفیت جس کا شعور رسولوں کی فطرت کو ہوتا ہے بسا اوقات ان کے ان اشارات سے مترشح ہوتی ہے جنھیں قرآن نقل کرتا ہے۔

مثال کے طور پر ہم اسے نوح علیہ السلام اور ان کی قوم کے درمیان ہونے والی اس گفتگو میں دیکھتے ہیں جسے قرآن ان الفاظ میں نقل کرتا ہے:

قَالَ يَا قَوْمِ أَرَءَيْتُمْ إِنْ كُنْتُ عَلَىٰ بَيِّنَةٍ مِنْ رَبِّي وَآتَانِي رَحْمَةً مِنْ عِنْدِهِ فَعُمِّيَتْ عَلَيْكُمْ أَنُلْزِمُكُمُوهَا وَأَنْتُمْ لَهَا كَارِهُونَ وَيَا قَوْمِ لَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مَالًا ۖ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَى اللَّهِ وَمَا أَنَا بِطَارِدِ الَّذِينَ آمَنُوا ۚ إِنَّهُمْ مُلَاقُو رَبِّهِمْ وَلَٰكِنِّي أَرَاكُمْ قَوْمًا تَجْهَلُونَ ۝ وَيَا قَوْمِ مَنْ يَنْصُرُنِي مِنَ اللَّهِ إِنْ طَرَدْتُهُمْ ۚ أَفَلَا تَذَكَّرُونَ ۝ (ھود: آیات ۲۸ - ۳۰)

اس نے کہا اے برادرانِ قوم! ذرا سوچو تو سہی کہ اگر میں اپنے رب کی طرف سے ایک کھلی شہادت پر قائم تھا اور پھر اس نے مجھ کو اپنی خاص رحمت سے بھی نواز دیا مگر وہ تم کو نظر نہ آئی تو آخر ہمارے پاس کیا ذریعہ ہے کہ تم ماننا نہ چاہو اور ہم زبردستی تمہارے سر چپیک دیں۔ اور اے برادرانِ قوم! میں اس کام پر تم سے کوئی مال نہیں مانگتا میرا اجر تو اللہ کے ذمہ ہے اور میں ان لوگوں کو دھکے دینے سے بھی رہا۔ جنھوں نے

میری بات مانی ہے وہ آپ ہی اپنے رب کے حضور جانے والے ہیں مگر میں دیکھتا ہوں کہ تم لوگ جہالت برت رہے ہو۔ اور اے قوم! اگر میں ان لوگوں کو دھتکاروں تو خدا کی پکڑ سے کون مجھے بچانے آئے گا۔ تم لوگوں کی سمجھ میں کیا اتنی بات بھی نہیں آتی۔

صالح علیہ السلام کی گفتگو میں بھی ہمیں یہی چیز نظر آتی ہے جنھیں قرآن ان الفاظ میں بیان کرتا ہے:-

قَالَ يَا قَوْمِ أَرَأَيْتُمْ إِنْ كُنْتُ عَلَىٰ بَيِّنَةٍ مِنْ رَبِّي وَآتَانِي مِنْهُ رَحْمَةً فَمَنْ يَنْصُرُنِي مِنَ اللَّهِ إِنْ عَصَيْتُهُ ۖ فَمَا تَزِيدُونَنِي غَيْرَ تَخْسِيرٍ ۝ (ھود: آیت ۶۳)

صالحؑ نے کہا: اے برادرانِ قوم! تم نے کچھ اس پر بھی غور کیا کہ اگر میں اپنے رب کی طرف سے ایک صاف شہادت رکھتا تھا اور پھر اس نے اپنی رحمت سے بھی مجھ کو نواز دیا تو اس کے بعد اللہ کی پکڑ سے مجھے کون بچائے گا اگر میں اس کی نافرمانی کروں۔ تم میرے کس کام آسکتے ہو سوائے اس کے کہ مجھے اور زیادہ خسارے میں ڈال دو۔

ابراہیم علیہ السلام کی گفتگو میں بھی ہم اسی حقیقت کا مشاہدہ کرتے ہیں جس کے الفاظ یہ ہیں:-

وَحَاجَّهُ قَوْمُهُ ۚ قَالَ أَتُحَاجُّونِّي فِي اللَّهِ وَقَدْ هَدَانِ ۚ وَلَا أَخَافُ مَا تُشْرِكُونَ بِهِ إِلَّا أَنْ يَشَاءَ رَبِّي شَيْئًا ۗ وَسِعَ

رَبِّی کُلَّ شَیْءٍ عِلْمًا ۭ اَفَلَا تَتَذَکَّرُوْنَ ؀ وَکَیْفَ اَخَافُ مَآ
اَشْرَکْتُمْ وَلَا تَخَافُوْنَ اَنَّکُمْ اَشْرَکْتُمْ بِاللّٰہِ مَا لَمْ یُنَزِّلْ
بِہٖ عَلَیْکُمْ سُلْطٰنًا ۭ فَاَیُّ الْفَرِیْقَیْنِ اَحَقُّ بِالْاَمْنِ ۚ اِنْ
کُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ؀ (الانعام۔ آیات ۸۰ - ۸۱)

اس کی قوم اس سے جھگڑنے لگی تو اس نے قوم سے کہا کیا تم لوگ اللہ کے معاملہ میں مجھ سے جھگڑتے ہو؟ حالانکہ اس نے مجھے راہِ راست دکھائی ہے اور میں تمہارے ٹھہرائے ہوئے شریکوں سے نہیں ڈرتا۔ ہاں اگر میرا رب چاہے تو وہ ضرور ہو سکتا ہے۔ میرے رب کا علم ہر چیز پر چھایا ہوا ہے۔ پھر کیا تم ہوش میں نہ آؤ گے؟ اور آخر میں تمہارے ٹھہرائے ہوئے شریکوں سے کیسے ڈروں۔ جب کہ تم اللہ کے رسول کے ساتھ ان چیزوں کو خدائی میں شریک ٹھہراتے ہوئے نہیں ڈرتے جن کے لیے اس نے تم پر کوئی سند نازل نہیں کی ہے؟ ہم دونوں فریقوں میں سے کون زیادہ بے خوفی و اطمینان کا مستحق ہے۔؟ بتاؤ اگر تم کچھ علم رکھتے ہو۔

یہی چیز ہمیں شعیب علیہ السلام کی گفتگو میں بھی نظر آتی ہے جب وہ کہتے ہیں:۔

قَالَ یٰقَوْمِ اَرَءَیْتُمْ اِنْ کُنْتُ عَلٰی بَیِّنَۃٍ مِّنْ رَّبِّیْ وَرَزَقَنِیْ
مِنْہُ رِزْقًا حَسَنًا ۭ وَمَآ اُرِیْدُ اَنْ اُخَالِفَکُمْ اِلٰی مَآ اَنْھٰکُمْ
عَنْہُ ۭ اِنْ اُرِیْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ ۭ وَمَا تَوْفِیْقِیْٓ
اِلَّا بِاللّٰہِ ۭ عَلَیْہِ تَوَکَّلْتُ وَاِلَیْہِ اُنِیْبُ ؀ (ھود آیت ۸۸)

شعیب نے کہا بھائیو! تم خود ہی سوچو کہ اگر میں اپنے رب کی طرف سے

ایک کھلی شہادت پر تھا اور پھر اس نے اپنے پاس سے مجھ کو اچھا رزق بھی عطا کیا تو اس کے بعد میں تمہاری گمراہیوں اور حرام خوریوں میں تمہارا شریک حال کیسے ہو سکتا ہوں؟ اور میں ہرگز نہیں چاہتا کہ جن باتوں سے میں تم کو روکتا ہوں ان کا خود ارتکاب کروں۔ میں تو اصلاح کرنا چاہتا ہوں جہاں تک بھی میرا بس چلے اور جو کچھ میں کرنا چاہتا ہوں اس کا سارا انحصار اللہ کی توفیق پر ہے اسی پر میرا بھروسہ ہے اور ہر معاملے میں میں اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں۔

اور یعقوب علیہ السلام کی گفتگو میں بھی ہمیں اسی حقیقت کی نمود ملتی ہے جب وہ اپنے لڑکوں سے اس طرح مخاطب ہوتے ہیں:۔

اِنَّمَآ اَشْکُوْا بَثِّیْ وَحُزْنِیْٓ اِلَی اللّٰہِ وَاَعْلَمُ مِنَ اللّٰہِ مَا لَا
تَعْلَمُوْنَ ؀

میں اپنی پریشانی اور اپنے غم کی فریاد اللہ کے سوا کسی سے نہیں کرتا۔ اور اللہ سے جیسا میں واقف ہوں تم نہیں ہو۔ (یوسف آیت ۸۶)

اسی طرح ہم تمام رسولوں کے ارشادات اور ان کی سیرت و کردار میں اس گہرے اور ان کی فطرت میں راسخ ہو جانے والے افکار کے اثرات پاتے ہیں جو ان کے ارشادات کو ان کی ضمیر کی گہرائیوں میں موجود جذبے سے لبریز کر دیتا ہے۔

آئے دن انسان کی خارجی معلومات کے دائرے میں ان مظاہر کا سراغ ملتا رہتا ہے جو دور ہی سے اس کائنات میں پائی جانے والی "وحدت" کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ انسانوں میں سائنس کی مہارت رکھنے والے اس نتیجے تک پہنچ چکے ہیں کہ

تخلیق کائنات میں وحدت کارفرما ہے اور اس وسیع کائنات میں ساری حرکات کا منبع ایک ہی ہے۔ انسان کے امکانی علم کی حدود میں یہ پتہ لگ چکا ہے کہ ایٹم ہی اس پوری کائنات کی عمارت کی بنیاد ہے نیز یہ کہ ایٹم اپنے اندر طاقت Energy رکھتا ہے اور اس طرح اس کائنات میں مادہ ایٹم کی صورت میں طاقت Energy سے جا ملتا ہے۔ اب مادہ اور قوت کی وہ دوئی ختم ہو گئی جو عرصے تک لوگوں کو محسوس ہوتی تھی۔ اب مادہ جو ایٹموں کا مجموعہ ہے ان ایٹموں کے ٹوٹنے پر طاقت بن جاتا ہے اور دوسری طاقتوں میں شامل ہو جاتا ہے، اسی طرح انسان کے امکانی علم کی حدود میں یہ حقیقت دریافت ہو چکی ہے کہ ایٹم کے اندر مستقل حرکت برپا ہے نیز یہ کہ وہ الیکٹرون Electron یا بجلی کی قوت کے مانند ذرات پر مشتمل ہے جو ایٹم کے مرکز نیوکلیس Nucleus کے گرد چکر لگاتے رہتے ہیں۔ نیز یہ کہ یہ حرکت ہر ایک ایٹم میں ایک ہی طرح پر مسلسل جاری ہے۔ اور جیسا کہ فریدالدین عطار نے کہا ہے کہ ہر ایٹم ایک سورج ہے جس کے گرد سیارے گردش کرتے رہتے ہیں جیسے کہ ہمارا سورج جس کے گرد سیارے مستقل گردش کرتے رہتے ہیں۔

تکوینی وحدت اور اس کائنات میں پائی جانے والی حرکت میں وحدت یہی دو مظاہر ہیں جن تک انسان اب تک پہنچ سکا ہے۔ اور یہ دو رہی سے ایک بڑی اور ہمہ گیر وحدت کے قانون کی طرف اشارہ کر رہے ہیں انسانی علم تو ان دونوں مظاہر کو اسی حد تک سمجھ سکا ہے جس حد تک کہ انسانی تجربے اور مشاہدے کے لیے ممکن تھا لیکن جن طبائع کو فیضِ الٰہی سے) خصوصی صلاحیتیں عطا ہوئیں انھوں نے آن واحد میں اس عظیم اور جامع قانون کو پورے کا پورا پا لیا کیونکہ انھوں نے اس کے بلا واسطہ

اور براہ راست القاء کو اخذ کر لیا اور صرف وہی ایسا کرنے کی صلاحیت رکھتی تھیں انھوں نے اس وحدت کے حق میں سائنٹفک تجربوں کے ذریعہ واقعات و مظاہر نہیں جمع کیے بلکہ چونکہ انھیں براہِ راست اس کو مکمل طور پر اخذ کر لینے کی صلاحیت عطا ہوئی تھی اس لیے انھوں نے اس ناموس واحد کا القا داخلی طور پر براہِ راست حاصل کر لیا جس کا منبع ایک ہی ناموس ہے اور جس کا صادر کرنے والا ایک ہی ہے۔ ان مخصوص مذہبی طبائع میں یہ باطنی صلاحیت حد درجہ باریک، ہمہ گیر اور کامل ہوتی تھی اس لیے کہ یہ بیک دفعہ اس الہام کے ماوراء پائے جانے والے مصدر کی وحدت اور اس عالم میں پائے جانے والے ارادے اور فاعلیت کی وحدت کا ادراک کر لیتی تھی۔ چنانچہ اس نے ایمانی طور پر اس کائنات کو چلانے والی ذاتِ الٰہی کے ایک ہونے کا اثبات کر دیا۔

میں یہ بات جدید سائنس کے اس خیال کی بنا پر نہیں کہہ رہا ہوں کہ اس نے کائناتی وحدت کے ایک یا دو مظاہر کی حقیقت پا لی ہے۔ اس لیے کہ سائنس اپنے میدان میں بعض چیزوں کو ثابت کرتی ہے اور ساتھ ہی بعض چیزوں کی نفی بھی کرتی ہے۔ وہ جن "حقائق" تک بھی پہنچ پاتی ہے وہ اضافی، جزئی اور محدود ہوتے ہیں اس لیے اس کے لیے کبھی بھی کسی آخری اور مطلق حقیقت تک رسائی ممکن نہیں اس پر یہ حقیقت مستزاد ہے کہ سائنس کے نظریات ہمیشہ بدلتے رہتے ہیں کبھی ایک نظر دوسرے کی تردید کر دیتا ہے اور کبھی اس میں کوئی ترمیم اور تبدیلی عمل میں لاتا ہے۔

میں نے تخلیق کائنات میں وحدت، اور اس میں پائی جانے والی حرکت میں وحدت کا ذکر اس لیے نہیں کیا ہے تاکہ رسولوں کے حواس میں وحدتِ ناموس

کے حاصل کر لینے کی صداقت کا ان سے جوڑ ملا سکوں۔ نہیں۔ بلکہ میرا مقصد کچھ اور ہے۔ میں کائنات کی حقیقت کے بارے میں سچے، کامل اور ہمہ گیر تصور کے تعلق سے قابلِ اعتماد ذرائع کی تعیین کرنا چاہتا ہوں۔

بسا اوقات بعض سائنسی اکتشافات کی رہنمائی ان بعض کائناتی مظاہر کی طرف ہو جاتی ہے جو اس 'بڑی وحدت' کی حقیقت سے متعلق ہوتے ہیں۔ یہ وحدت جو اس سے پہلے اپنے وسیع، ہمہ گیر اور بلاواسطہ دائرے میں رسولوں کے احساس کو چھو چکی ہوتی ہے۔ اور لدنی فطرت، کامل اور ہمہ گیر طریقے پر اس کا براہ راست ادراک کر چکی ہوتی ہے۔ یہ فطرت، بذاتِ خود صداقت کی حامل ہے خواہ جدید سائنس کے نظریات کی رہنمائی اس کے بعض مظاہر کی طرف ہو سکے یا نہ ہو سکے۔ اس لیے کہ سائنس کے نظریات میں، خود سائنس ہی کی طرف سے، ہر آن بحث و مراجعت کی گنجائش موجود ہے۔ نیز اولاً تو یہ ثابت شدہ حقائق نہیں ہیں اور پھر نہ آخری ہیں اور نہ مطلق۔ اس طرح یہ (نظریات) اس کے اہل نہیں رہ جاتے کہ ان کے پیمانے سے رسالت کی صحت جانچی جا سکے۔ اس لیے کہ پیمانے کے لیے ضروری ہے کہ مطلق اور متعین ہو۔ اس سے یہ بات نکلتی ہے کہ رسالت ہی وہ واحد پیمانہ ہے جو متعین اور مطلق ہے۔

اس حقیقت سے ایک دوسری حقیقت نمودار ہوتی ہے جو غیر معمولی اہمیت کی حامل ہے۔ یہ خاص طبائع جو ناموس عالم سے براہِ راست ملے ہوتے ہیں یہی انسانیت کے لیے کسی ہمہ گیر رخ کی نشاندہی کر سکتے ہیں۔ ایسے رخ کی جو کائنات کی فطرت سے ہم آہنگ ہو۔ اس کے اٹل قوانین اور اس کے ناموس عام کے موافق ہو۔ یہی طبائع ہیں جو براہ راست اللہ تعالیٰ کی وحی کو اخذ کرتی ہیں پس نہ غلطی کرتی ہیں اور نہ صحیح راستے

سے ہٹتی ہیں نہ غلط بیانی کرتی ہیں اور نہ چھپانے کی کوشش کرتی ہیں۔ نیز زمان و مکان کے عوامل بھی انہیں حقیقت تک پہونچنے سے روک نہیں سکتے۔ اس لیے کہ وہ اس حقیقت کو براہ راست اللہ تعالیٰ سے اخذ کرتی ہیں جو زمان و مکان کی قید سے بالاتر ہے۔

مشیتِ ایزدی نے چاہا کہ وقفے وقفے سے رسولوں کو بھیجتی رہے تاکہ انسانیت 'حقیقت مطلقہ' سے ہم آغوش ہو سکے۔ اس حقیقت سے جس کے کسی ایک گوشے تک پہنچنے میں بھی تجربہ و مشاہدہ کو سینکڑوں برس لگ جاتے اور اس پوری حقیقت تک تو صدیوں کے بعد بھی کبھی رسائی ممکن نہ ہوتی۔ انسانیت کے اس حقیقت سے ہم آغوش ہو جانے کی اہمیت کا راز یہ ہے کہ اس طرح انسان کی راہ اور کائنات کی راہ ایک ہو جاتی ہے۔ اور اس کی حرکتیں کائنات کی حرکت کے ساتھ، اور اس کی فطرت کائنات کی فطرت کے ساتھ ہم آہنگ ہو جاتی ہے۔

اب گویا ایک ہی منبع ہے جس سے انسان، کائنات کی حقیقت کے تعلق سے، انسانی وجود کی حقیقت کے تعلق سے، کائنات کی غایت کے تعلق سے اور انسانی وجود کی نہایت کے تعلق سے، سچے، کامل اور ہمہ گیر تصور کو اخذ کر سکتا ہے۔ اور اسی تصور کی آغوش سے وہ واحد، صحیح اور سیدھا نقطۂ نظر جنم لے سکتا ہے۔ جو کائنات کی پائیداری کی حقیقت، اس کی حرکت کی حقیقت اور اس کے رخ کی حقیقت سے مطابقت رکھتا ہے۔ اور جس کے ذریعہ لوگ پورے کے پورے امن و چین اور سلامتی میں داخل ہو جاتے ہیں۔ اس کائنات کے ساتھ سلامتی میں، اپنی فطرت کے ساتھ سلامتی میں جو اس کائنات کی بھی فطرت ہے۔ اور دنیا کی زندگی میں انسان کے لیے جو سعی و عمل اور نشو و ارتقاء میسر کیا گیا ہے اس میں بھی ایک دوسرے کے درمیان

امن و آشتی اسی طریقے کے اختیار کرنے میں مضمر ہے۔

(حقیقت کے ادراک کا) ایک ہی منبع ہے۔ جو رسالتوں کا منبع ہے۔ اس کے علاوہ جو کچھ ہے گمراہی اور باطل ہے۔ کیونکہ وہ اس مصدرِ وحید سے اخذ نہیں کرتا جو اسے حق تک یا حق کو اس تک پہنچانے والا ہو۔

انسان کو معرفت کے جو دوسرے وسائل عطا ہوتے ہیں وہ ایک اندازے کے مطابق عطا ہوئے ہیں اور اسی قدر عطا ہوئے ہیں جس قدر کہ زمین میں خلافت کا بار اٹھانے اور زندگی کی نشوونما اور اس کی پیہم ترقی کے لیے ناگزیر ہے۔ بسا اوقات وہ اس میدان میں بہت دور کی منزلوں تک جا پہنچتا ہے لیکن یہ منزلیں کبھی بھی اسے اس "حقیقتِ مطلقہ" کے دائرے تک نہیں پہنچا سکتیں جس کی کہ اسے اپنا طرزِ زندگی متعین کرنے کے لیے ضرورت ہے۔ اپنے طرزِ زندگی کی تعیین اسے صرف بدلتے ہوئے نت نئے احوال و ظروف کے مطابق نہیں کرنی ہے بلکہ کائنات کے ان عام ثابت قوانین کے مطابق کرنی ہے جن پر اس کا وجود قائم ہے اور اس بڑے مقصد کے مطابق کرنی ہے جو ساری انسانیت کا مقصدِ وجود ہے۔ یہی مقصد ہے جسے انسانوں کا خالق دیکھ لیتا ہے وہ خالق جو زمان و مکان کی قیود سے بالاتر ہے البتہ اسے یہ محدود انسان نہیں دیکھ سکتا جو زمان و مکان کی بندشوں میں جکڑا ہوا ہے۔

پورا راستہ وہی طے کر سکتا ہے جو پورے راستے کو سامنے رکھ کر سفر کا پروگرام بنائے۔ انسان اس راستے کو دیکھنے سے قاصر ہے۔ اس کی نظر سے آنے والا لمحہ بھی اوجھل ہے۔ اِس کے اور اُس کے درمیان ایک طویل پردہ حائل ہے۔ کسی انسان کے لیے ممکن نہیں کہ یہ جان سکے کہ اس پردے کے پیچھے کیا ہے۔ پھر انسان کے لیے کیسے

ممکن ہو سکتا ہے کہ اس نامعلوم راہ کو طے کرنے کے لیے کوئی پروگرام بنا سکے؟

دو ہی راہیں ممکن ہیں، یا تو وہ بھٹکتا رہے، گمراہ ہو اور سرکشی کرے۔ یا اس طریقے کی طرف واپس آجائے جو خالق کائنات سے اخذ کردہ ہے۔ یہ طریقہ رسالت اور رسولوں کا طریقہ ہے۔ یہ ان فطرتوں کا طریقہ ہے جو وجود اور خالقِ وجود سے رشتہ جوڑے ہوئے ہے۔

رسالت کا سلسلہ یکے بعد دیگرے قائم رہا جو انسانیت کی انگلی پکڑ کر ہدایت اور روشنی کے ساتھ (سیدھے) راستے پر آگے بڑھاتا رہا۔ اور انسانیت کبھی یہاں بھٹکی اور کبھی وہاں بھٹکی اور راستے سے ہٹتی رہی۔ وہ رہبر کی پکار سے غفلت برتتی رہی۔

ہر بار ایک ہی حقیقت اس کے لیے نسبتاً زیادہ ترقی یافتہ صورتوں میں ظاہر ہوتی رہی جو اس کائنات کے نت نئے تجربات کے عین مطابق ہوتی تھی یہاں تک کہ آخری رسالت کا وقت آیا تو عقل کی پختگی کا دور شروع ہو چکا تھا چنانچہ آخری رسالت نے عقلِ انسانی کو حقیقت کی تمام کلیات کے ساتھ مخاطب کیا تاکہ انسانیت ان آخری اور وسیع نشانات کی رہنمائی میں اپنا سفر جاری رکھے۔ حقیقتِ کبریٰ کے یہ نقوش اس قدر تابندہ تھے کہ اب انھیں کسی نئی رسالت کی ضرورت باقی نہ رہی بس ان کے لیے صرف یہ بات کافی ہے کہ ہر صدی میں ان کی تفسیر کرنے والے اور ان کی تجدید کرنے والے لوگ اٹھتے رہیں۔

اب انسانیت کے لیے دو ہی راستے ہیں یا تو وہ اس ہمہ گیر دائرے کے اندر رہ کر چلے جو اس کے لیے ہمیشہ کافی ہوگا اور جس میں اس کی نت نئی اور ترقی پذیر ضرورتوں کے لیے پوری گنجائش موجود ہے۔ یہ راستہ اسے "حقیقتِ مطلق" تک پہنچاتا ہے

جس تک انسانیت کسی دوسرے راستے سے نہیں پہونچ سکتی — یا وہ سرکشی اختیار کرے اور گمراہ ہوجائے اور حیرانی کے صحرا میں منتشر ہو کے رہ جائے اور انجام کار نشانات، راہ سے دور نکل جائے ۔

ایمان باللہ

میں عقل کا مقام اور کردار

لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَى اللهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ ۔

تاکہ ان کو مبعوث کردینے کے بعد لوگوں کے پاس اللہ کے مقابلے میں کوئی حجت نہ رہے۔ (النساء آیت ۱۶۵)

اس آیت پر نظر ڈالتے ہوئے ہمارے سامنے لطیف اور گہرے خیالات کا ایک سیلاب امڈتا نظر آتا ہے۔ لیکن اس تفسیر میں ہم جو اختصار ملحوظ رکھتے رہے ہیں اس کے پیش نظر صرف تین باتوں کو سامنے لائیں گے۔

سب سے پہلے ہم یہ دیکھتے ہیں کہ انسانی زندگی کے نازک ترین مسئلے، یعنی ایمان باللہ کے مسئلے میں عقل کا مقام کیا ہے؟ وہ اس سلسلے میں کیا کچھ کرسکتی ہے اور اس میں اس کا کیا رول ہے؟ یہ مسئلہ نازک ترین اس لیے ہے کہ دنیا میں انسانی زندگی کا بنیادی طور پر اسی پر دار و مدار ہے۔ یہی زندگی کی قدریں، اس کا مجموعی رخ اور اس کی بہت سی عملی تفصیلات کو متعین کرتا ہے۔ اور اسی پر آخرت میں انسان کے

فی ظلال القرآن، پانچواں ایڈیشن ۱۹۶۷ء جلد ۲ پارہ ۶ صفحات ۲۵-۳۵

انجام کا بھی انحصار ہے اور یہی زیادہ اہم ہے۔

اگر اللہ تعالیٰ یہ سمجھتا ہوتا، جب کہ وہ انسان اور اس کی جملہ قوتوں کو سب سے زیادہ جاننے والا ہے، کہ عقل، جس سے اس نے انسان کو نوازا ہے، اس کے لیے کافی ہے کہ وہ اپنے آپ ہدایت تک پہنچ جائے اور دنیا و آخرت میں اپنے مصالح کا ادراک کر لے، اگر اللہ تعالیٰ یہ سمجھتا رہا ہوتا تو اسے تنہا اس عقل کے حوالے کر دیتا کہ وہ آفاق و انفس میں ہدایت کے دلائل اور ایمان کے دواعی کو تلاش کرے اور اپنے لیے اس طرزِ عمل کی تعیین کرے جس کے مطابق اس کی زندگی بسر ہوتی ہے۔ اور پھر حق و صواب کے راستے پر گامزن ہو جائے۔ اگر ایسا ہوتا تو اللہ تعالیٰ تاریخ کے ہر دور میں اس کے پاس رسولوں کو نہ بھیجتا اور وہ اپنے بندوں کے خلاف اس بات کو حجت نہیں قرار دیتا کہ ان کے پاس رسولوں کو بھیجا گیا اور انھوں نے ان تک اللہ کا پیغام پہنچا دیا اور نہ اپنے حضور لوگوں کے لیے اس بات کو حجت بننے دیتا کہ ان کے پاس رسول نہیں آئے: لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ۔

لیکن جب اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ نے دیکھا کہ عقل، جسے اس نے انسان کو عطا فرمایا ہے، ایسا آلہ ہے جو اپنے آپ ——— رسالت کی رہنمائی اور اس کے تعاون و انضباط کے بغیر۔ ہدایت تک پہنچنے سے قاصر ہے اور ایسے ہی وہ انسانی زندگی کے لیے کسی ایسے دستور العمل کی نشاندہی سے قاصر ہے جو اس زندگی کے واقعی مصالح کو روبکار لا سکے اور اپنے ماننے والے کو دنیا و آخرت دونوں کے انجام بد سے بچا سکے۔ چونکہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ کو یہ اچھی طرح معلوم تھا اس لیے اس کی 'حکمت' نے چاہا اور اس کی 'رحمت' کا اقتضا ہوا کہ وہ لوگوں کے پاس رسولوں کو بھیجے اور لوگوں کا مواخذہ اسی وقت کرے جب کہ

رسول ان کے پاس آ چکے ہوں اور اللہ کا پیغام ان تک پہنچ چکا ہو: وما کنا معذبین حتّٰی نبعث رسولا (الاسراء آیت ۱۵) (اور ہم عذاب دینے والے نہیں ہیں جب تک کہ (لوگوں کو حق و باطل کا فرق سمجھانے کے لیے) ایک پیغامبر نہ بھیج دیں) یہ ایک بدیہی بات ہے جو قرآن کی اس نص سے ٹپکتی ہے اور اگر بدیہی نہ مانا جائے تو کم از کم اس کا حتمی اقتضا ہے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ عقل کا کیا کام ہے؟ ایمان و ہدایت کے مسئلے میں اس کا رول کیا ہو سکتا ہے؟ اور قانونِ حیات اور نظامِ زندگی کے مسئلے میں وہ کیا کردار ادا کر سکتی ہے؟

عقل کا کام یہ ہے کہ وہ رسالت کے منبع سے اخذ کرے اور رسول سے جو کچھ اخذ کرتی ہے اسے سمجھے۔ رسول کا کام یہ ہے کہ وہ لوگوں تک پیغام پہنچائے، اس کی وضاحت کرے اور انسانی فطرت پر میل کچیل کی جو تہیں جم گئی ہوں انھیں صاف کرے۔ اور پھر یہ کہ وہ عقلِ انسانی کو آگاہ کر دے تاکہ وہ آفاق و انفس میں پائے جانے والے ہدایت کے دلائل اور ایمان کی طرف لے جانے والے اشاروں پر غور کر سکے۔ پھر رسول کا یہ کام بھی ہے کہ وہ صحیح طور پر اخذ کرنے اور صحیح انداز پر غور کرنے کے طریقے کی نشاندہی کر دے، اس کے لیے وہ بنیاد استوار کر دے جس پر عملی زندگی کا وہ ضابطہ تشکیل پا سکے جو دنیا و آخرت دونوں کی فلاح کا ضامن ہو۔

عقل کا یہ منصب نہیں ہے کہ وہ دین اور اس کے اٹل اصولوں پر صحیح یا غلط ہونے۔ یا قبول کرنے یا رد کر دینے کی حیثیت سے کوئی حکم لگا سکے جب کہ یہ

بات تحقیق سے معلوم ہو چکی ہو کہ دین کا بھیجنے والا اللہ ہے اور (دین کا) مفہوم اچھی طرح سمجھا جا چکا ہو۔ اچھی طرح سمجھنے سے ہماری مراد یہ ہے کہ لغوی اور اصطلاحی معنی سمجھ لیے گئے ہوں۔ اگر عقل کو نص کے مدلول کو اچھی طرح سمجھ لینے کے بعد بھی یہ اختیار حاصل ہو کہ اسے قبول کرے یا رد کر دے، صرف اس لیے کہ وہ اس معنی سے موافقت نہیں رکھتی یا اسے قبول کرنا نہیں چاہتی، تو ہدایت کے (بیان) کے بعد اس سے انکار پر انسان کو اللہ کے عذاب کا مستحق نہ ٹھہرایا جاتا۔ معلوم ہوا کہ انسان دین کے اصولوں کو قبول کرنے کا پابند ہے جب کہ یہ اصول اس تک صحیح طریقوں سے پہنچے ہوں اور اس کی عقل نے اس کے معنی و مدعا کو ٹھیک طور پر سمجھ لیا ہو۔

رسالت عقل کو خطاب کرتی ہے اس معنی میں کہ اسے بیدار کرتی ہے، اس کی رہنمائی کرتی ہے، اور اسے صحیح غور و فکر کا طریقہ بتاتی ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ الٹے عقل ہی رسالت کی صحت یا عدم صحت کا فیصلہ کرنے لگے اور اس کے رفض و قبول میں خود مختار بن جائے۔ نہیں بلکہ جب بھی نص ثابت ہو گی فیصلہ اسی کے مطابق ہو گا اور انسانی عقل کے لیے لازمی ہو گا کہ اسے قبول کرے، اس کو مانے اور اسے نافذ کرے بلالحاظ اس کے کہ نص کا مدلول اس کے لیے مانوس ہے یا اجنبی۔

اس سلسلے میں عقل کا کام صرف اتنا ہے کہ وہ نص کا مفہوم متعین کرے یعنی یہ کہ لغت اور اصطلاح کی رو سے عبارت کے جو معنی بنتے ہوں اس کے مطابق نص کا مدلول کیا ہے؟ عقل کا کام اسی پر ختم ہو جاتا ہے۔ عقل اس کی مجاز نہیں ہے کہ نص کے صحیح مدلول کو باطل قرار دے یا اس کے مطابق عمل نہ کرنے کا فیصلہ دے۔ اس لیے کہ نص اللہ کی طرف سے ہے اور عقل کوئی خدا نہیں کہ اس کے ٹھیک یا

غلط ہونے کا حکم لگائے یا اسے قبول کرنے یا ترک کر دینے کا فیصلہ کرے۔

یہی باریک نکتہ ہے جو اکثر گڈمڈ کیا جاتا ہے اسے وہ لوگ بھی گڈمڈ کرتے ہیں جو عقل انسانی کو خدا بنا دیتے ہیں چنانچہ وہ اسے دین کے ثابت حقائق کے ٹھیک یا غلط ہونے کے بارے میں فیصلہ کن قرار دیتے ہیں اور اسے وہ لوگ بھی گڈمڈ کرتے ہیں جو عقل کو یک قلم معزول کر دینا چاہتے ہیں۔ اور ایمان و ہدایت کے معاملہ میں اس کا کوئی دخل تسلیم نہیں کرتے۔

صحت و اعتدال کی راہ وہی ہے جسے ہم نے یہاں بیان کیا ہے یعنی یہ کہ رسالت عقل کو خطاب کرتی ہے تاکہ وہ اس کے حقائق کا ادراک کرے۔ وہ اس کے لیئے ان حقائق بلکہ زندگی کے تمام معاملات میں غور و فکر کے صحیح طریقے کی نشاندہی کرتی ہے۔

پس جب عقل رسالت کے حقائق کا ادراک کرے یعنی نص کا مفہوم کیا ہے اسے سمجھ لے تو اس کا کام اس کے سوا کچھ اور نہیں رہ جاتا کہ اس کی تصدیق کرے، اس کو مانے اور اس کو نافذ کرے، رسالت انسان کو اس کا مکلف تو قرار نہیں دیتی کہ جب تک اس نے ان اصولوں کو سمجھا ہو یا نہ سمجھا ہو، ان پر عمل کرے لیکن وہ اسے اس کی اجازت بھی نہیں دیتی کہ وہ نصوص کے معنی کے مطابق ان اصولوں کو سمجھ لینے کے بعد ان پر بحث کا دروازہ کھولے کہ بات مانی جائے یا وہ صحیح ہے یا غلط ہے جب کہ اسے اچھی طرح معلوم ہو کہ بات اللہ کی طرف سے آئی ہے جو حق ہی کہتا ہے۔ اور خیر ہی کا حکم دیتا ہے۔

اللہ تعالےٰ سے (ہدایت) اخذ کرنے کا صحیح طریقہ یہ نہیں ہے کہ عقل دین کے ثابت شدہ حقائق کے مفہوم کو ٹھیک طور پر سمجھ لینے کے بعد ان کے مقابلے میں اپنی طرف سے پہلے سے طے کیے ہوئے کچھ خفوق لائے جنھیں اس نے منطقی مقدمات سے ترتیب دیا ہو یا جو اس کے محدود مشاہدات اور ناقص تجربات کا نتیجہ ہوں۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ

وہ ثابت نصوص کو لے اور ان کی روشنی میں اپنے اصولوں کو ترتیب دے۔ کیونکہ یہ نصوص اس کے اپنے اصولوں سے زیادہ صحیح ہیں اور ان کا طریقہ اس کے ذاتی طریقے سے زیادہ درست ہے، وہ ذاتی طریقہ جسے صحیح دینی غور و فکر کے معیاروں کی روشنی میں نہ ترتیب دیا گیا ہو معلوم ہوا کہ عقل دین کے ثابت شدہ حقائق کو جانچنے کے لیے اپنے وضع کردہ اصولوں کو معیار نہیں بنا سکتی۔

عقل خدا نہیں ہے کہ اپنے بنائے ہوئے اصولوں کو معیار بنا کر اللہ کے دیئے ہوئے اصولوں کو جانچے۔ بلاشبہ عقل کو یہ اختیار حاصل ہے کہ کسی نص سے سمجھے ہوئے ایک انسانی مفہوم کے مقابلے میں دوسرا مفہوم پیش کرے۔ ایسا کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے اس سلسلے میں عقل پر کوئی پابندی نہیں عائد کی جا سکتی بشرطیکہ صحیح اصولوں کی بنیاد پر اس کی گنجائش موجود ہو کہ اس نص کی متعدد تاویلیں کی جا سکیں اس سے ایک سے زیادہ معنی اخذ کیئے جا سکیں۔ فہم و تاویل کے اس وسیع میدان میں عقل انسانی کو آزادیٔ فکر و نظر کی پوری ضمانت حاصل ہے بشرطیکہ وہ صحیح اصولوں کے مطابق ہو اور ان ضابطوں کے تحت ہو جنھیں خود دین مقرر کرتا ہے۔ نص کے صحیح مفہوم کی تعیین اور اس کے انطباق کی صورتوں کے تعلق سے کسی انسانی ادارے، کسی اقتدار اور کسی شخص کو عقل پر پابندی لگانے کا اختیار نہیں جب کہ نص متعدد رایوں کا احتمال رکھتی ہو اور بحث و نظر ان صحیح ضابطوں کے حدود کے اندر اور اس صحیح طریقے کے مطابق ہو جو دین کے ثابت شدہ اصولوں سے ماخوذ ہوں۔ یہی معنی ہیں اس بات کے کہ رسالت عقل کو خطاب کرتی ہے۔

بے شک اسلام ایک عقلی دین ہے۔ اس معنی میں کہ وہ عقل کو اپنی بات

سمجھانے کے لیے اصول و مبادی پیش کرتا ہے بجائے اس کے کہ خرق عادت پر مبنی واقعات کے ذریعہ اس سے بات منوائے۔ جس کے بعد کہ عقل کے لیے اس کے تسلیم کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ رہ جاتا ہو وہ عقل کو خطاب کرتا ہے۔ اس معنی میں کہ اس کے لیے غور و فکر کا صحیح انداز فراہم کرتا ہے۔ اسے آفاق و انفس میں پائے جانے والے ایمان کے دواعی اور ہدایت کے دلائل پر غور و فکر کے لیے دعوت دیتا ہے تاکہ وہ اپنی فطرت سے عادات و مالوفات اور نادانی کے گرد و غبار کو ہٹا سکے وہ عقل کو خطاب کرتا ہے اس معنی میں کہ دین کے اصول جن عبارتوں میں بیان ہوئے ہیں ان کے معنی کی تعیین عقل کے حوالے کی گئی - وہ اس پر لازم کرتا کہ کسی ایسی چیز پر ایمان لائے جس کے مدلول کو وہ سمجھ ہی نہ سکی ہو۔ یا جس کے معانی کا ادراک ہی نہ کر سکی ہو۔ لیکن جب انسان نص کے مدلولات کا ادراک کرے اور اس کے اصولوں کو سمجھ لے تو اس کے سامنے اس کے سوا چارہ نہیں کہ اسے تسلیم کرے تو اس صورت میں وہ مومن ہوگا۔ یا اسے تسلیم کرنے سے انکار کر دے جس کے بعد وہ کافر قرار پائے گا۔ وہ ان مدلولات کے صحیح یا غلط ہونے کا فیصلہ کرنے کی مجاز نہیں اور نہ اس بات کی مجاز ہے کہ چاہے انھیں قبول کرے یا رد کر دے جیسا کہ ان لوگوں کا خیال ہے جو عقل کو خدا بنا دینا چاہتے ہیں کہ وہ ثابت شدہ دینی حقائق میں سے جسے چاہے قبول کرے اور جسے چاہے رد کر دے، جسے چاہے لے اور جسے چاہے چھوڑ دے۔ یہی صورت ہے جس کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: افتؤمنون ببعض الکتاب وتکفرون ببعض (البقرہ آیت ۸۵) (تو کیا تم کتاب کے ایک حصے پر ایمان لاتے ہو اور دوسرے حصے کے ساتھ کفر کرتے ہو) وہ اس طرز عمل پر کفر کا اطلاق کرتا ہے۔ اور اس کو سزا کا مستوجب قرار دیتا ہے۔

پس جب اللہ تعالیٰ کائنات، انسان یا دوسری مخلوقات سے متعلق کسی

حقیقت کی تعیین فرما دے یا فرائض و نواہی کے باب میں کوئی متعین ہدایت دے دے تو خدا کی اس مقرر کردہ چیز کو قبول کرنا اور اس کے مطابق عمل کرنا ہر اس شخص کے لیے ضروری ہے جس تک یہ بات پہنچی ہے اور وہ اس کے منشا کو سمجھ لیتا ہے۔

پس جب اللہ تعالےٰ فرماتا ہے:۔

اللَّهُ الَّذِي خَلَقَ سَبْعَ سَمَاوَاتٍ وَمِنَ الْأَرْضِ مِثْلَهُنَّ ؕ

(اللہ وہ ہے جس نے سات آسمان بنائے اور زمین کی قسم سے بھی انہیں کے مانند۔ (الطلاق: آیت ۱۲)

أَوَلَمْ يَرَ الَّذِينَ كَفَرُوا أَنَّ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنَاهُمَا ۖ وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ ؕ

کیا وہ لوگ جنھوں نے (نبی کی بات ماننے سے) انکار کر دیا ہے غور نہیں کرتے کہ یہ سب آسمان اور زمیں باہم ملے ہوئے تھے پھر ہم نے انھیں جدا کیا اور پانی سے ہر زندہ چیز پیدا کی۔ (الانبیآء: آیت ۳۰)

وَاللَّهُ خَلَقَ كُلَّ دَابَّةٍ مِّن مَّاءٍ ۚ

اور اللہ نے ہر جاندار کو پانی سے پیدا کیا (النور آیت ۴۵)

خَلَقَ الْإِنسَانَ مِن صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ ۙ وَخَلَقَ الْجَانَّ مِن مَّارِجٍ مِّن نَّارٍ ۚ

انسان کو اس نے ٹھیکری جیسے سوکھے سڑے ہوتے گارے سے بنایا اور جن کو آگ کی لپٹ سے پیدا کیا۔ (الرحمٰن آیت ۱۴-۱۵)

اسی طرح نظامِ قدرت اور کائنات، اس کی زندہ مخلوقات، اور دیگر موجودات کے

بارے میں اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ جو کچھ فرماتا ہے وہی حق ہے۔ نص کا مفہوم اور ان پر مبنی حقائق کو سمجھ لینے کے بعد عقل کو یہ کہنے کا حق نہیں کہ میرے حقائق، میرے علم اور میرے تجربے میں یہ بات نہیں آئی ہے۔ اس لیے کہ اس میدان میں عقل کے دریافت کردہ حقائق صحیح بھی ہو سکتے ہیں اور غلط بھی۔ لیکن اللہ سبحانہٗ وتعالےٰ نے جو بات متعین طور پر بتا دی ہے اس میں حق و صواب کے سوا کسی اور شئی کا احتمال نہیں۔

اسی طرح جب اللہ تعالےٰ فرماتا ہے:۔

وَمَن لَّمْ يَحْكُم بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ ۝

جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی کافر ہیں۔ (المائدہ: آیت ۴۴)

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَذَرُوا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبَا إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ۝ فَإِن لَّمْ تَفْعَلُوا فَأْذَنُوا بِحَرْبٍ مِّنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ ۖ وَإِن تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوسُ أَمْوَالِكُمْ لَا تَظْلِمُونَ وَلَا تُظْلَمُونَ ۝

اے ایمان لانے والو! خدا سے ڈرو اور جو کچھ تمھارا سود لوگوں پر باقی رہ گیا ہے اسے چھوڑ دو اگر واقعی تم ایمان لائے ہو لیکن اگر تم نے ایسا نہ کیا تو آگاہ ہو جاؤ کہ اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے اعلان جنگ ہے۔ اب بھی توبہ کر لو (اور سود چھوڑ دو) تو اصل لینے کے تم حقدار ہو نہ تم ظلم کرو نہ تم پر ظلم کیا جائے۔ (البقرہ: آیات ۲۷۸-۲۷۹)

وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُولَىٰ

اپنے گھروں میں ٹک کر رہو اور سابق دورِ جاہلیت کی سی سج دھج

نہ دکھاتی پھرو۔ (الاحزاب آیت ۳۳)

وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ ص وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ۔

اور اپنے سینوں پر اوڑھنیوں کے آنچل ڈالے رہیں اور اپنا بناؤ سنگار نہ ظاہر کریں۔ (النور آیت ۳۱)

اسی طرح جو کچھ اللہ تعالے نے انسان کے طرزِ زندگی کے باب میں فرما دیا ہے تو حق وہی ہے جسے اس نے فرمایا ہے۔ عقل کو یہ کہنے کا اختیار نہیں کہ مجھے مصلحت فلاں باتوں میں نظر آتی ہے۔ جو اللہ کے حکم کے خلاف ہیں، جن کی اللہ نے اجازت نہیں دی اور انسانوں کے لیے مشروع نہیں قرار دیا اس لیے کہ عقل جسے مصلحت تصور کرتی ہے۔ اس میں صحت اور غلطی دونوں کا امکان ہے۔ اور بسا اوقات شہوات و میلانات اس کا محرک بنتے ہیں۔ البتہ اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ جس چیز کو طے فرما دے وہی ٹھیک ہوتی ہے اور اسی میں بھلائی ہوتی ہے۔

جب نص ثابت ہو اور اس کا مطلب قطعیت کے ساتھ متعین ہو اور اس پر زمانے کی قید نہ ہو تو اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ نے عقائد و تصورات کے باب میں جو کچھ فرمایا ہے اور طرزِ زندگی اور قانونِ حیات سے متعلق جو کچھ بتایا ہے دونوں کے سلسلے میں عقل کی پوزیشن ایک ہی ہے عقل کو یہ کہنے کا اختیار نہیں کہ: عقائد و عبادات تو مجھے تسلیم ہیں لیکن میرے خیال میں قانونِ حیات اور نظامِ زندگی کے سلسلے میں زمانہ بدل چکا ہے۔ اس لیے کہ اگر اللہ تعالے نص کے مدلول کو کسی خاص زمانے تک محدود رکھنا چاہتا تو اس نے ایسا کر دیا ہوتا۔ جب نص مطلق ہوگی اس کے لیے زمانۂ نزول اور بعد کے زمانے

دونوں یکساں ہیں۔ اگر انسان اللہ تعالے کے مقابلے میں جسارت دکھانے اور اس کے علم کو ناقص اور محدود قرار دینے کی جرأت سے بچنا چاہتا ہو تو یہ موقف اختیار کرنا ضروری ہے کہ سُبْحَانَهٗ وَتَعَالٰى عَمَّا يَقُوْلُوْنَ عُلُوًّا كَبِيْرًا (الاسرا آیت ۴۳)

(پاک ہے وہ اور بہت بالا و برتر ہے ان باتوں سے جو یہ لوگ کہہ رہے ہیں) اجتہاد عام نص کو جزئی حالات پر منطبق کرنے میں ہوتا ہے نہ کہ کسی خاص زمانے میں عقل کی کسی بات سے متاثر ہو کر نص پر مبنی عام اصول کے ماننے یا نہ ماننے میں۔

ہم یہ جو بات کہہ رہے ہیں اس سے کسی بھی درجہ میں عقل کی قدر و قیمت کو کم کرنا یا انسانی زندگی میں اس کے رول کو گھٹانا لازم نہیں آتا اس لیے کہ نصوص کو نت نئے حالات پر منطبق کرنے کا کام اس کے لیے ایک وسیع میدان فراہم کرتا ہے۔ بشرطیکہ وہ بحث و نظر کے اس طریقے اور غور و فکر کے ان پیمانوں سے منضبط ہو چکی ہو جو اللہ کے دین اور اس کی صحیح تعلیم سے ماخوذ ہوں۔ پھر اس سے زیادہ وسیع میدان یہ ہے کہ وہ اس کائنات کے قوانین، اس کے اندر پائی جانے والی قوتوں اور طاقتوں اور اس کے مدفون ذخیروں کا پتہ لگائے اور اس کی موجودات اور جاندار مخلوقات کی طبیعت کو سمجھنے کی کوشش کرے۔ پھر عقل کے لیے وسیع تر میدان یہ ہے کہ وہ انسان کے لیے مسخر کی ہوئی اس کائنات اور اس کی جاندار اور غیر جاندار موجودات سے استفادہ کرے، زندگی کو پروان چڑھائے، اسے تبدیلیوں سے آشنا کرے اور ترقی کے مدارج طے کرے۔ مگر یہ سب کچھ خدا کے طے کردہ حدود کے اندر ہونا چاہئے اس طرح نہیں جس طرح کہ خواہشات و شہوات چاہتی ہوں۔ جو عقل کو گمراہ کرتی اور فطرت کو آرائشوں سے ڈھک لیتی ہیں۔

آئیے اس آیت :

(لئلا یکون للناس علی اللہ حجۃ بعد الرسل)

(تاکہ ان کو مبعوث کر دینے کے بعد لوگوں کے پاس اللہ کے مقابلہ میں کوئی حجت نہ رہے)

پر ایک بار پھر غور کریں، اس میں اس عظیم ذمہ داری کا ذکر آیا ہے جو پوری انسانیت کے سلسلہ میں رسولوں پر ڈالی گئی تھی۔ اور ان کے بعد ان لوگوں پر جو ان کی رسالت پر ایمان لائے۔ یہ ذمہ داری جتنی عظیم الشان ہے اتنی ہی بھاری بھی ہے۔

یقیناً دنیا و آخرت دونوں میں پوری انسانیت کا انجام رسولوں سے، اور ان کے بعد ان کے متبعین سے وابستہ ہے دنیا و آخرت دونوں میں انسانوں کی کامیابی یا ناکامی کا انحصار اس پر ہے کہ انبیاء ان کے سلسلے میں اپنی ذمہ داری ادا کریں اسی کے مطابق لوگوں کی جزا و سزا کا حساب بھی ہوگا۔

یقیناً یہ معاملہ بہت بڑا اور گھبرا دینے والا ہے اسی لیے انبیاء کرامؑ جن پر یہ ذمہ داری ڈالی جاتی تھی، اس کے بھاری ہونے کو برابر محسوس کرتے تھے اور اسی لئے اللہ تعالیٰ بھی انہیں اس بوجھ کی حقیقت سے، جسے وہ ان کے سر ڈالتا تھا برابر آگاہ کرتا رہتا تھا۔ آیت کریمہ:

إِنَّا سَنُلْقِي عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيلًا (المزمل ۵)

ہم تم پر ایک بھاری کلام نازل کرنے والے ہیں۔

میں بھی اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو یہی حقیقت بتائی ہے۔ پھر متعدد آیات میں انہیں یہ سکھایا گیا ہے کہ وہ اس ذمہ داری کو ادا کرنے کے لیے اپنے کو تیار کریں:

يَا أَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ ۝ قُمِ اللَّيْلَ إِلَّا قَلِيلًا ۝ نِصْفَهُ أَوِ انْقُصْ

مِنْهُ قَلِيلًا ۝ أَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْآنَ تَرْتِيلًا ۝ إِنَّا سَنُلْقِي عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيلًا ۝ (المزمل آیات ۱-۵)

(اے کپڑا اوڑھنے والے رات کو نماز میں کھڑے رہا کرو مگر کم، آدھی رات، یا اس سے کچھ کم کرلو، یا اس سے کچھ زیادہ بڑھا دو اور قرآن کو خوب ٹھیر ٹھیر کر پڑھو ہم تم پر ایک بھاری کلام نازل کرنے والے ہیں۔

إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْآنَ تَنْزِيلًا ۝ فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تُطِعْ مِنْهُمْ آثِمًا أَوْ كَفُورًا ۝ وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ بُكْرَةً وَأَصِيلًا ۝ وَمِنَ اللَّيْلِ فَاسْجُدْ لَهُ وَسَبِّحْهُ لَيْلًا طَوِيلًا ۝ (الدہر: آیت ۲۳-۲۶)

اے نبی! ہم نے ہی تم پر یہ قرآن تھوڑا تھوڑا کرکے نازل کیا ہے۔ لہٰذا تم اپنے رب کے حکم پر صبر کرو اور ان میں سے کسی بدعمل یا منکر حق کی بات نہ مانو۔ اپنے رب کا نام صبح و شام یاد کرو۔ رات کو بھی اس کے حضور سجدہ ریز ہو اور رات کے طویل اوقات میں اس کی تسبیح کرتے رہو۔

اور یہی وہ بات ہے جس کا شعور اللہ تعالیٰ ان آیات کے ذریعہ نبیؐ کے اندر پیدا کرنا چاہتا ہے۔ اس میں آپؐ کو ان باتوں کے اعلان کا حکم فرمایا اور اس بات کا کہ خود انہیں سمجھیں:

قُلْ إِنِّي لَنْ يُجِيرَنِي مِنَ اللَّهِ أَحَدٌ ۝ وَلَنْ أَجِدَ

مِنْ دُوْنِهٖ مُلْتَحَدًا ۙ اِلَّا بَلٰغًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِسٰلٰتِهٖ ؕ

کہو مجھے اللہ کی گرفت سے کوئی نہیں بچا سکتا اور نہ میں اس کے دامن کے سوا کوئی جائے پناہ پا سکتا ہوں۔ میرا کام اس کے سوا کچھ نہیں کہ اللہ کی بات اور اس کے پیغامات پہنچا دوں۔ (الجن: آیت ۲۲-۲۳)

عٰلِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖۤ اَحَدًا ۙ اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ فَاِنَّهٗ يَسْلُكُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ رَصَدًا ۙ لِّيَعْلَمَ اَنْ قَدْ اَبْلَغُوْا رِسٰلٰتِ رَبِّهِمْ وَاَحَاطَ بِمَا لَدَيْهِمْ وَاَحْصٰى كُلَّ شَيْءٍ عَدَدًا ۠
(الجن آیت ۲۶-۲۸)

وہ عالم الغیب ہے۔ اپنے غیب پر کسی کو مطلع نہیں کرتا سوائے اس رسول کے جسے اس نے (غیب کا کوئی علم دینے کے لیے) پسند کر لیا ہو تو اس کے آگے اور پیچھے وہ محافظ لگا دیتا ہے۔ تاکہ وہ جان لے کہ انھوں نے اپنے رب کے پیغامات پہنچا دیئے اور وہ ان کے پورے ماحول کا احاطہ کیے ہوئے ہے اور ایک ایک چیز کو اس نے گن رکھا ہے۔

یقیناً یہ معاملہ بہت بڑا اور گھرا دینے والا ہے، سارے انسانوں کی ذمہ داری ان کی زندگی اور موت، کی ان کی کامیابی اور ناکامی اور ان کی جزا و سزا کی، معاملہ یوں ہے کہ یا تو انسانیت تک یہ پیغام پہنچتا ہے پس وہ اسے قبول کرتی اور اس کی اتباع کرتی ہے اور پھر اس کے نتیجے میں دنیا اور آخرت دونوں میں سعادت حاصل کرتی ہے۔ اور یا اس تک یہ پیغام پہنچتا ہے لیکن وہ اسے قبول کرنے سے انکار کر دیتی

ہے، اور اسے مسترد کر دیتی ہے۔ اور پھر اس کے نتیجہ میں دنیا اور آخرت دونوں میں شقاوت سے دوچار ہوتی ہے، اور یا اس تک یہ پیغام پہنچے ہی نہیں تو اس صورت میں اسے اپنے رب کے خلاف حجت پیش کرنے کا حق ہوگا۔ پھر دنیا میں اس کی شقاوت اور گمراہی کی ذمہ داری ان لوگوں کے سر ہوگی جنھیں اس پیغام کے پہنچانے کا مکلف بنایا گیا لیکن انھوں نے اسے لوگوں تک نہ پہنچایا۔

جہاں تک انبیائے کرام کا تعلق ہے انھوں نے تو یہ امانت ہمارے حوالہ کر دی اور ہم تک پیغام پہنچا دیا اور وہ اس بھاری ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو کر اپنے پروردگار سے جا ملے۔ انھوں نے اس پیغام کو صرف زبان سے دی ہوئی دعوت کے طور پر نہیں پہنچایا بلکہ ساتھ ہی اسے عمل کے پیکر میں ڈھال کر ایک نمونہ بھی پیش فرما گئے۔ انھوں نے اس راہ کے موانع و مشکلات کے ازالہ کے لیے شب و روز جہاد جاری رکھا۔ خواہ یہ موانع و مشکلات ان شبہات کی شکل میں پائے جاتے ہوں جو دلوں میں کھٹکتے تھے یا ان گمراہیوں کی صورت میں جنھیں خوبصورت بنا کر پیش کیا جاتا تھا۔ یا یہ مشکلات وہ سرکش طاقتیں ہوں جو لوگوں کو دعوت کے قبول کرنے سے روکتی ہوں اور انھیں دین کے سلسلے میں آزمائشوں میں مبتلا کرتی ہوں۔ اللہ کے رسول خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا ہی کیا کیونکہ آپ آخری پیغامبر تھے اور آپ ہی کا پیغام آخری پیغام تھا۔ چنانچہ آپ نے زبان ہی سے رکاوٹوں کے ہٹانے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ زبان کے ساتھ ساتھ تیر و کمان سے بھی انھیں ہٹا کر دکھا دیا:

حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ ؕ (البقرہ ۱۹۳) (یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین اللہ کے لیے ہو جائے)

اب یہ بھاری ذمہ داری آپ کے بعد آنے والوں، ان لوگوں پر جو آپ کی

رسالت پر ایمان لائے ہیں، عائد ہوتی ہے۔ چنانچہ آپ کے بعد نسلوں پر نسلیں آتی رہیں گی۔ اور ان نسلوں تک اس پیغام کے پہنچانے کی ذمہ داری آپ کے بعد آپ کے متبعین پر ہے۔ ان کے لیئے اس ذمہ داری۔ لوگوں پر اللہ کی حجت قائم کرنے کی ذمہ داری، اور لوگوں کو آخرت کے عذاب اور دنیا کی شقاوت سے بچانے کی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کی اس کے علاوہ کوئی صورت نہیں کہ وہ اس پیغام کو لوگوں تک پہنچائیں اور اس امانت کو لوگوں کے حوالہ کر دیں۔ اسی طریقے سے جس طرح کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پیغام کو لوگوں تک پہنچایا تھا۔ اور یہ امانت ان کے حوالہ کی تھی، کیونکہ پیغام بھی وہی پیغام ہے۔ گمراہیاں، نفس پرستیاں شکوک وشبہات اور ہوا وہوس کی پرستش آج بھی موجود ہے۔ آج بھی ایسی سرکش اور باغی طاقتیں موجود ہیں جو انسانوں اور دعوت کے درمیان سد راہ ہیں اور انھیں پہلے ہی کی طرح سبز باغ دکھا کر اور طاقت کا سہارا لے کر دین سے پھیرنے کی کوشش کرتی ہیں آج بھی (اس کے لیئے) وہی موقف، وہی مشکلات اور وہی انسان ہیں اور خطاب بھی پہلے ہی کی طرح انسانوں ہی سے ہے۔

اس پیغام کو پہنچانا اور امانت کی ذمہ داری ناگزیر ہے، زبان سے بھی اس کا پہنچایا جانا ضروری ہے اور عمل سے بھی اس کی ترجمانی ناگزیر ہے۔ یہاں تک کہ اس پیغام کے پہنچانے والوں کی زندگی اپنے پیغام کا نمونہ بن چکی ہو۔ ان رکاوٹوں کا دور کرنا بھی ضروری ہے جو دعوت کی راہ میں حائل ہوں اور لوگوں کو باطل کی مدد سے یا طاقت کا سہارا لے کر دین سے پھیرنے کی کوشش کرتی ہوں۔ یہ نہ ہوا تو اس پیغام کے پہنچنے اور اس امانت کی حوالگی کا حق پوری طرح ادا نہ ہو سکے گا یقیناً اس لازمی فریضہ سے

بچ نکلنے کا کوئی راستہ نہیں کیونکہ اس سے کترانے کا مطلب یہ ہوگا کہ ساری انسانیت کی گمراہی کی ذمہ داری، دنیا میں اس کی شقاوت کی ذمہ داری اور آخرت میں اس پر خدا کی حجت کے قائم نہ ہونے کی ذمہ داری اپنے سر لی جائے، ان ساری باتوں کا ذمہ دار قرار پانا اور جہنم سے نجات نہ پانا۔

کون ہے جو اس بھاری بوجھ کو ہلکا سمجھ سکتا ہے، جو کمر توڑ دینے والا، جوڑ جوڑ ہلا دینے والا۔ اور سارے بدن پر لرزہ طاری کر دینے والا ہے۔

یقیناً جو شخص اس بات کا دعویٰ کرتا ہے کہ وہ مسلمان ہے، اس کے سامنے صرف دو ہی راستے ہیں۔ یا تو وہ اپنے دعویٰ کے مطابق اس پیغام کو لوگوں تک پہنچائے اور یہ امانت ان کے حوالہ کر دے ورنہ وہ نہ تو دنیا میں نجات حاصل کر سکے گا اور نہ آخرت میں اس سے ہمکنار ہو سکے گا۔ جب وہ یہ دعویٰ کرتا ہے کہ وہ مسلمان ہے مگر ہر ممکن راستہ اپنا کے اس پیغام کے پہنچانے اور امانت کے ادا کرنے کا اہتمام نہیں کرتا تو وہ اس اسلام کے خلاف گواہی دیتا ہے جس کا وہ دعویٰ کرتا ہے۔ بجائے اس کے کہ وہ اسلام کے حق میں گواہی دیتا اور اس آیت کریمہ کا مصداق بن جاتا: وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ط (البقرہ آیت ۱۴۳) (اور اسی طرح تو ہم نے تمھیں ایک امتِ (وسط) بنایا ہے تاکہ تم دنیا کے لوگوں پر گواہ ہو اور رسول تم پر گواہ ہو)

ایک مسلمان کے اسلام کے حق میں گواہ بننے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے وہ ذاتی طور پر، پھر اس کا گھر اور خاندان اور پھر اس کے اعزہ واقربا سب اس کے ساتھ اس اسلام کا جیتا جاگتا نمونہ بن جائیں جس کی طرف وہ دعوت دے رہا ہے۔ اس گواہی

کا دوسرا مرحلہ یہ ہوگا کہ اپنے گھر، خاندان، برادری اور (اعزہ واقربا) کو دعوت دینے
کے بعد امت کو اس بات کی دعوت دے کر وہ اپنی پوری زندگی میں ـــــ انفرادی،
اجتماعی، سیاسی، اقتصادی ـــــ اسلام کو نافذ کرے۔ اس گواہی کا آخری مرحلہ ان
مشکلات کو دور کرنے کے لیے جہاد ہے جو لوگوں کی گمراہی کا سبب بنتی ہیں اور انھیں
فتنے میں مبتلا کرتی ہیں۔ خواہ یہ مشکلات کسی قسم کی بھی ہوں۔ جب اسے اس جہاد میں اپنی
جان سے ہاتھ دھونا پڑے تو وہ شہید قرار پائے گا۔ جس نے اپنے دین کے لیے گواہی
دے دی اور اپنے پروردگار سے جاملا۔ ایسا ہی آدمی حقیقی معنوں میں شہید ہے۔

آئیے اس مطالعہ کے آخر میں ہم اللہ تعالےٰ کے اس جلال وعظمت کے حضور
کھڑے ہوں جو نافرمانی اور سرکشی کرنے والے اس انسانی وجود کے سلسلے میں اس کے علم،
عدل، پرورش، فضل وکرم اور شفقت ورحمت کی صورت اختیار کیے ہوئے ہے۔
انسانی وجود کے بارے میں اس کے علم کی عظمت، اور اس کے وجود کو اس نے جو
قوتیں اور صلاحیتیں عطا فرمائی ہیں اور اس کی ساخت میں ہدایت وگمراہی کی جو
استعداد رکھی ہے، ان پر غور کیجیے۔ پھر یہ دیکھیے کہ اپنے اس علم کی روشنی میں کس
طرح اللہ تعالیٰ نے یہ مناسب نہیں سمجھا کہ انسان کو صرف اس کی عقل کے سہارے چھوڑ
دیا جائے۔ باوجود اس کے کہ خدا کا عطا کردہ یہ ذریعہ (عقل) بڑی عظمت کا حامل ہے
اور باوجود اس کے کہ آفاق وانفس میں ہدایت کے بے شمار دلائل موجود ہیں جو انسان
کو ایمان لانے پر آمادہ کرتے ہیں۔ اس لیے کہ اللہ تعالےٰ کو معلوم تھا کہ انسان کی
خواہشات اور اس کے میلانات اس عظیم نعمت سے صحیح طور پر فائدہ اٹھانے نہیں
دیتے اور بسا اوقات انفس وآفاق کے اندر پھیلے ہوئے بے شمار دلائل پر انسانی

اغراض اور خواہشاتِ نفس پردہ ڈال دیتی ہیں نیز انسان کی نادانی اور اس کی نارسائی
بھی اس راہ میں بڑی رکاوٹ ہیں۔ انھیں وجوہ کی بنا پر اللہ تعالےٰ نے ہدایت و
گمراہی کی ذمہ داری عقلِ انسانی پر اسی صورت میں ڈالی جب کہ رسالت اور اس کی
وضاحت عمل میں آچکی ہو۔ اس وضاحت اور رہنمائی کے بعد بھی اس نے انسانی
عقل پر اس نظامِ زندگی کے تیار کرنے کی ذمہ داری نہیں ڈالی۔ بلکہ اس کی ذمہ داری
صرف یہ قرار دی کہ اس نظام کو، جسے اللہ نے اس کے لیے مقرر کر دیا ہے، منطبق
کرے۔ اس کے بعد کے سارے کام اللہ نے انسانی عقل کے اوپر چھوڑ دیے ہیں۔ یہ
ایک وسیع میدان ہے اللہ نے اس وسیع میدان کو انسان کے لیے جس طرح مسخر
فرما دیا ہے اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے عقل کو پوری آزادی حاصل ہے کہ نئی
راہیں اختیار کرے، ترمیمات کرے، اضافے عمل میں لائے اور جن چیزوں کو مناسب
سمجھے اس نظامِ زندگی میں جگہ دے (یہ سب اللہ تعالیٰ نے یہ جانتے ہوئے کیا کہ)
انسان کی عقل غلطی بھی کر سکتی ہے۔ صحیح راہ بھی اختیار کر سکتی ہے۔ اس کے قدم
راہِ حق پر قائم بھی رہ سکتے ہیں اور اس سے دور بھی جا سکتے ہیں۔

اس طریقہ کار کی عظمت پر غور کیجیے جس کے مطابق اگر اللہ نے انسانوں کی
طرف خوشخبری دینے اور ڈرانے والے رسولوں کو نہ بھیجا ہوتا تو اللہ کے خلاف انھیں
ایک دلیل میسر آجاتی جب کہ کائنات کی کھلی کتاب اور نفس کے بند اوراق میں
وہ بے شمار نشانیاں بھری پڑی ہیں جو خالق کے وجود، اس کی وحدانیت، اس کی
تدبیر اور تقدیر اور اس کی قدرت اور علم کی گواہی دیتی ہیں۔ نیز جب کہ انسانی
فطرت بھی ایسے جذبات ومیلانات اور دواعی سے بھری پڑی ہے جو اسے اپنے

خالق سے جاملنے اور خود کو اس کے سپرد کر دینے پر آمادہ کرتے ہیں۔ ان جذبات و
میلانات و دواعی اور آفاق و انفس میں خالق کے وجود کے پائے جانے والے دلائل
کے درمیان مناسبت، اور گہری ہم آہنگی پائی جاتی ہے اور جب کہ اس کے ساتھ اس
نے انسان کو عقل کے اس بیش بہا عطیہ سے نوازا ہے جو ان نشانیوں کو ایک ایک کر
کے شمار کر سکتی اور ان سے نتائج اخذ کر سکتی ہے۔ لیکن چونکہ اللہ تعالیٰ کمزوری کے
ان عوامل سے اچھی طرح واقف تھا جو اخذ و استنباط کی ان قوتوں اور مذکورہ بالا
جذبات و میلانات پر طاری ہو جاتے ہیں۔ پھر وہ انھیں معطل کر دیتے ہیں، بگاڑ کر
رکھ دیتے ہیں ناکارہ بنا دیتے ہیں یا پھر ان کے فیصلوں میں اپنی طرف سے غلطیوں
اور کوتاہیوں کو شامل کر دیتے ہیں۔ اس لیے اس نے انسان پر صرف کائنات، فطرت
اور عقل میں پائے جانے والے دلائل کی بنا پر حجت قائم کرنے سے معذور رکھا۔
تاآنکہ وہ اس کے پاس رسولوں کو نہ بھیج دے تاکہ وہ اس کی ان تمام صلاحیتوں
کو ان بیماریوں سے بچا دیں جو ان پر طاری ہو جاتی ہیں اور ان تمام صلاحیتوں کو
اللہ کی طرف سے دیئے ہوئے ان سچے پیمانوں کے مطابق منضبط کریں جن کی
علمبردار رسالت ہوتی ہے۔ ان الٰہی پیمانوں کے مطابق منضبط ہو جانے کے بعد
یہ صلاحیتیں جو فیصلہ کریں گی وہی معتبر ہوں گے۔ اور صرف اسی صورت میں ان
پر لازم آئے گا کہ وہ حق کو تسلیم کریں اور اس کی اطاعت و پیروی کریں ورنہ ان
کی کوئی دلیل قائم نہیں ہوگی اور سزا کے مستحق ہوں گے۔

اس ربوبیت، فضل و کرم اور شفقت و رحمت کی عظمت پر غور کیجئے جسے
اللہ تعالیٰ اپنی اس مخلوق کے ساتھ روا رکھتا ہے جسے اس نے چن کر اونچے

مقام سے نوازا ہے، باوجودیکہ وہ اس کی کمزوریوں اور کوتاہیوں کو خوب جانتا ہے،
اس نے یہ وسیع سلطنت یعنی خلافت ارضی انسان کے حوالہ کر دی انسان کی نسبت
سے بلاشبہ یہ ایک وسیع سلطنت ہے اگرچہ خدا کی بادشاہت میں اس کی
حیثیت محض ایک ذرے کی ہے جسے خدا کا ہاتھ پکڑے ہوئے ہے تاکہ وہ اس
عظیم بادشاہت میں گم نہ ہو جائے۔

پھر اس کی ربوبیت، فضل و کرم اور شفقت و رحمت اس کی متقاضی ہوئی
کہ وہ انسان کو صرف اپنی ودیعت کردہ اس فطرت کے سہارے نہ چھوڑ دے جو
ہدایت کی طرف رجحان رکھتی ہے لیکن اس سے دور بھی رہ سکتی ہے۔ نہ اس عقل کے
سہارے جو رہنمائی کے لیے ہے لیکن بھٹک بھی سکتی ہے۔ بلکہ اس کا پروردگار
مزید نوازش کرتا رہا اور یکے بعد دیگرے ان کے پاس رسولوں کو بھیجتا رہا۔ انسان
انھیں جھٹلاتا ہے اور ان کی دشمنی پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ ان سے دور بھاگتا ہے
اور کنارہ کش ہو جاتا ہے پھر بھی اس کا پروردگار اس کی دانستہ اور نادانستہ غلطیوں
پر اسے پکڑتا نہیں، نہ ہی اس سے اپنی رافت و رحمت اور اپنی نوازشوں کو
روکتا ہے اور نہ ہی اسے ہدایت کے داعی اپنے رسولوں کے ہاتھوں ہدایت
کرنے سے محروم کرتا ہے۔ پھر اس وقت تک اسے نہ دنیا میں سزا دیتا ہے۔ نہ
آخرت میں جب تک کہ اس کے پاس رسول بھیجے جائیں اور وہ ان سے منہ پھیر
لے اور ان کا انکار کر دے اور پھر اپنے اسی انکار پر حالت میں توبہ اور اللہ کی
طرف رجوع کیے بغیر ہی مر جائے۔

حیرت ہے ایسا زمانہ بھی آسکتا ہے کہ یہ انسان اس زعم میں مبتلا ہو جائے

کہ وہ اپنے پروردگار سے بے نیاز ہے۔ اس کی پرورش، اس کے فضل اور شفقت و رحمت سے بے نیاز، اس کی ہدایت، اس کے دین اور اس کے رسولوں سے بے نیاز۔ بے نیازی کا یہ زعم اس ذریعہ (عقل) کی بنا پر ہے۔ جس کے بارے میں اس کا پروردگار خوب جانتا ہے کہ جب تک اسے خدا کے بتائے ہوئے طریقہ پر درست نہ رکھا جائے وہ فائدہ نہیں پہنچا سکتی اور اسی وجہ سے اس نے رسالت و وضاحت کے بغیر اسے سزا کا مستحق نہیں ٹھہرایا۔ اس انسان کو دیکھ کر ہمارے سامنے اس بچے کی تصویر آکھڑی ہوتی ہے جو اپنے پاؤں میں کچھ طاقت محسوس کرتا ہے تو ان ہاتھوں کو ہٹانے لگتا ہے جو اب تک اسے سہارا دیئے ہوئے تھے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اِدھر اُدھر ڈگمگانے لگتا ہے اور گر پڑتا ہے۔ لیکن اس مثال میں بچے کا یہ عمل فطرت کے عین مطابق اور اس سے قریب تر ہے۔ اس لیے کہ وہ ہاتھ سے بے نیازی کی کوشش کر کے، جو اسے اب تک سہارا دیتے ہوئے تھا، فطرت کی آواز پر لبیک کہتا ہے تاکہ اس کے وجود کے اندر پوشیدہ قوتیں ابھر سکیں اور وہ طاقتیں پروان چڑھ سکیں جن میں ایسا کرنے کی صلاحیت ہو۔ اور تاکہ آہستہ آہستہ اس کے اعصاب و عضلات نشو و نما پا سکیں اور مشق سے ان میں طاقت آجائے۔ لیکن آج کا انسان جو اپنے آپ سے خدا کے ہاتھ کو دور کرنا چاہتا ہے اور اس کی ہدایت سے پہلو تہی کر رہا ہے تو اللہ کو اچھی طرح معلوم ہے کہ اس کا وجود، اپنی تمام تر پوشیدہ صلاحیتوں کے باوجود، کسی ایسی صلاحیت کا مالک نہیں ہے جو اسے اللہ کے ہاتھ اور اس کی ہدایت سے بے نیاز کر دے۔ اس کی صلاحیتوں کی پہنچ زیادہ سے زیادہ یہاں تک ہے کہ وہ اللہ کی رسالت کی مدد سے رہنمائی حاصل کر لے اور

راہِ راست پر قائم رہے۔ مگر جب وہ اللہ کی ہدایت سے پہلو تہی کرے اور تمام تر بھروسہ خود اپنے اوپر کرے تو لازماً گمراہ ہوگا اور اختلال و انتشار کا شکار ہوگا۔

یہ خیال کہ بڑی بڑی عقلیں رسالت کے بغیر اس مقام تک پہنچ سکتی تھیں جس تک کہ وہ رسالت کی مدد سے پہنچ سکیں، اگر فریب دہی اور گمراہ کرنے کی کوشش نہیں تو غلط اور گمراہ ضرور ہے۔ اس لیے کہ عقل رسالت کے ساتھ ہی غور و فکر کے صحیح طریقے اختیار کر سکتی ہے۔ پھر اگر اس کے بعد وہ (صحیح رایوں کی) تطبیق میں غلطی کرتی ہے تو اس غلطی کی مثال اس گھڑی کی غلطی کی سی ہوگی جو ٹھیک بنی ہوئی ہے بعد میں اس پر آب و ہوا کے عوامل غالب آجاتے ہیں یا جس دھات سے وہ بنی ہوئی ہے ان عوامل کا اثر اس پر پڑ جاتا ہے۔ اس کی مثال اس گھڑی کی سی نہ ہوگی جو سرے سے ٹھیک بنی ہی نہ ہو بلکہ بے ترتیبی اور اتفاقات کے رحم و کرم پر چھوڑ دی گئی ہو ظاہر ہے دونوں میں بڑا فرق ہے۔

اس بات کی دلیل کہ عقل رسالت کی مدد سے جس درجۂ کمال کو حاصل کر لیتی ہے اس کے بغیر اسے ہرگز حاصل نہیں کر سکتی اور عقل انسانی رسالت سے بے نیاز نہیں ہو سکتی، یہ ہے کہ انسانی تاریخ میں پائی جانے والی کوئی نادرۂ روزگار عقل اس مقام تک نہیں پہنچ سکی جس تک معمولی اور متوسط درجے کی عقلیں رسالت کے ذریعہ رہنمائی حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئیں۔ یہ بات اعتقادات، اخلاقیات، نظامِ زندگی کی تشکیل نیز اس نظام کے تعلق سے تفصیلی قوانین مرتب کرنے پر یکساں طور پر صادق آتی ہے۔

بلاشبہ افلاطون اور ارسطو کی عقلیں بہت بڑی عقلیں تھیں بلکہ کچھ لوگوں کا کہنا یہ

ہے کہ ارسطو کی عقل سب سے بڑی عقل ہے جس سے انسانیت آشنا ہے حالانکہ وہ اللہ کی رسالت اور اس کی ہدایت سے بے نیاز تھی۔ لیکن جب ہم اس کے تصور الٰہ، یا اس کی صراحت کی روشنی میں جائزہ لیں تو ہمیں وہ زبردست بُعد نظر آجاتا ہے جو اس تصور اور رسالت سے رہنمائی حاصل کرنے والے ایک عام مسلمان کے تصور الٰہ میں پایا جاتا ہے۔

قدیم مصر میں اخناتون توحید کے عقیدے تک پہنچ گیا تھا۔ اگر ہم اس بات کو بعید بھی مان لیں کہ اس نے اس نظریے تک پہونچنے میں عقیدۂ توحید کی اس شمع سے ضرور روشنی حاصل کی ہوگی جسے حضرت ابراہیمؑ اور یوسفؑ کی رسالت نے روشن کیا تھا۔ پھر بھی اخناتون کے عقیدے میں جو خلا ہے اور اس میں جن اخرافات کی آمیزش ہے وہ اس فاصلے کو دور سے دور تر کر دیتے ہیں جو اس کے درمیان اور ایک عام مسلمان کے عقیدۂ توحید کے درمیان پایا جاتا ہے۔

صدر اول میں جب اسلام کی حکمرانی تھی ہمیں متوسط درجہ کے انسانوں میں بھی جن کی تربیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی تھی۔ ایسے نمونے مل جاتے ہیں جن تک تاریخ کے طویل وقفے میں پائے جانے والے وہ غیر معمولی اشخاص پہنچتے تک نظر نہیں آتے جو کسی سماوی رسالت سے فیضیاب نہ تھے۔

اسی طرح اسلام کا نظام اس کے اصولوں اور اس کے تفصیلی قوانین میں رفعت و بلندی کے ساتھ ہمیں جو اعتدال و توازن نظر آتا ہے وہ کسی دوسرے نظام، دوسرے اصول اور کسی قانون میں نظر نہیں آتا۔ نیز وہ سماج جسے اسلام نے برپا کیا تھا، اس کے اندر جو توازن اور نظم و ضبط پایا جاتا تھا نیز

اس کے اندر زندگی جتنی آسان اور نشاط انگیز تھی ہمیں وہ سماج کسی دوسرے خطۂ ارض میں دوبارہ جنم لیتا نظر نہیں آتا، نہ اس زمانے ہی میں نہ اس زمانہ سے پہلے اور نہ اس زمانہ کے بعد۔

یقیناً اس سلسلے میں کسی تہذیب کے مادی معیار کو فیصلہ کن مقام نہیں ملنا چاہئے اس لئے کہ مادی تہذیب کی روز افزوں ترقی کا دار و مدار ان وسائل پر ہے جنھیں ترقی پذیر سائنس برابر ایجاد کرتی رہتی ہے۔ لیکن ہر زمانے میں زندگی کی حقیقی بلندی اور ترقی کا معیار وہ نظم و ضبط اور توازن ہوتا ہے جو اس کے تمام اجزاء، اس کے تمام گوشوں اور اس کی تمام صورتوں میں پایا جاتا ہے۔ اور یہ توازن ہی ہے جس کے نتیجہ میں ہمہ گیر سعادت رونما ہوتی ہے اور ہر طرف امن و سکون کا دور دورہ ہو جاتا ہے۔ نیز یہ بھی توازن ہی ہے جو جملہ انسانی صلاحیتوں کو کام کرنے کا موقع دیتا ہے بغیر اس کے کہ اس کے بے شمار گوشوں میں سے کسی ایک گوشے میں بھی کسی کو دبایا جائے یا کوئی اپنی حد سے تجاوز کر جائے۔

تاریخ انسانی کا وہ دور جس میں اسے مکمل طور پر اسلام کے زیر سایہ زندگی گزارنے کا موقع ملا، انسانیت کسی بھی زمانے میں 'رسالت' سے دور ہو کر اس مقام تک نہ پہنچ سکی۔ کھوکھلا پن اور عدم توازن اس زندگی کی دائمی چھاپ ہے جو اسلام کے علاوہ کسی دوسرے نظام کے زیر سایہ بسر کی جا رہی ہو۔ خواہ اس کے بعض گوشوں میں کتنی چمک دمک کیوں نہ نظر آتی ہو۔ اور ان میں ہر طرف چہل پہل اور ہماہمی دکھائی دیتی ہو۔ اگر اس کے بعض گوشوں میں چمک دمک ہوتی ہے تو

دوسرے گوشے گھٹا ٹوپ تاریخی کا شکار ہوتے ہیں۔ اگر ایک طرف چہل پہل ہوتی ہے تو دوسری سمت میں بھیانک سناٹا ہوتا ہے۔ اس صورت حال کے ساتھ انسانیت سسکتی، کراہتی اور نحوست و بدبختی کا شکار ہوتی ہے۔

تخلیق کا قرآنی تصور
اور سائنس

وَلَقَدْ خَلَقْنٰكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ[1]

اور ہم نے تمہاری تخلیق کی ابتدا کی پھر تمہاری صورت بنائی۔ (الاعراف۱۱)

خلق کے معنے وجود میں لانے کے اور تصویر کے معنے صورت اور خصوصیات عطا کرنے کے بھی ہوتے ہیں۔ یہ دونوں اٹھان کے درجے ہیں، نہ کہ مرحلے۔ کیونکہ "ثم" کبھی زمانی ترتیب کے بجائے معنوی ترقی ظاہر کرنے کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے صورت گری کا عمل مجرد وجود سے اونچا مرتبہ رکھتا ہے کیونکہ خام مادہ بھی وجود رکھتا ہے لیکن صورت گری جس کے معنے انسانی صورت شکل اور خصوصیات عطا کرنے کے ہیں۔ وجود کے مدارج سے بلند تر درجہ ظاہر کرتا ہے۔ گویا کہ اللہ تعالٰے نے یہ فرمایا ہے کہ، ہم نے تم کو صرف وجود نہیں بخشا بلکہ اسے ترقی پذیر خصوصیات کا حامل وجود بنایا۔ یہ

---

[1] : فی ظلال القرآن، پانچواں ایڈیشن ۱۹۶۷ء جلد ۳ پارہ ۸۔ صفحات ۱۲۶، ۱۳۸ اور ۱۴۹

اللہ تعالیٰ کے اس قول کی طرح ہے کہ "الذی اعطی کل شیئی خلقہ ثم ھدٰی" (جس نے ہر چیز کو اس کی صورت دی پھر راہ دکھائی) (طٰہٰ ۵۰) ہر چیز کو اس کی تخلیق کے وقت اس کی خصوصیات دی گئیں اس کا کام بتایا گیا اور اس کام کی انجام دہی کے سلسلے میں اس کی رہنمائی فرمائی گئی۔ تخلیق اور خصوصیات و کردار نیز رہنمائی عطا کرنے کے درمیان کوئی زمانی فصل نہیں تھا۔ اگر ہدایت کے معنی اللہ کی طرف رہنمائی کرنے کے لیے جائیں تو بھی اس معنے میں فرق نہ آئے گا پھر یہ سمجھا جائے گا کہ ہر چیز کی تخلیق کے وقت اس کو اس کے رب کی طرف رہنمائی فرمائی گئی یہی آدم کے ساتھ بھی ہوا اس کی تخلیق کے وقت ہی اسے اس کی صورت اور انسانی خصوصیات دی گئیں۔ ہم جس معنے کو ترجیح دیتے ہیں وہ یہ ہے کہ "ثم" درجہ کی بلندی ظاہر کرتا ہے نہ کہ زمانی ترتیب۔

بہر صورت آدم علیہ السلام کی تخلیق اور جنسِ انسان کی اٹھان کے سلسلے میں قرآن کے تمام نصوص اس رائے کو ترجیح دیتے ہیں کہ اس مخلوق کو اس کی انسانی خصوصیات اور اس کا منفرد کردار عطا کرنے کا کام اس کی تخلیق کے ساتھ ہی انجام پایا تھا۔ انسانی تاریخ میں ترقی ان خصوصیات کے ظہور و ارتقاء، ان میں مہارت اور ان کے معیار میں بلندی حاصل کرنے کے اعتبار سے ہوئی ہے۔ انسان کے وجود میں ترقی نہیں عمل میں آئی ہے کہ ایک نوع سے ترقی کر کے دوسری نوع بن جانے کے مسلسل عمل سے انسان وجود میں آیا ہو جیسا کہ ڈارونیت کا کہنا ہے۔

نشو و ارتقاء کے نظریے کا زمین کی کھدائی سے برآمد ہونے والی چیزوں کے بھروسے پر یہ کہنا کہ حیوانات میں ایک دوسرے سے ترقی یافتہ مراحل رہے ہیں جن

کے درمیان زمانی ترتیب پائی گئی ہے محض ایک ظنی نظریہ ہے، یقینی امر نہیں ہے کیونکہ طبقات الارض میں چٹانوں کی عمروں کی تعیین خود ایک ظنی امر ہے۔ ستاروں سے نکلنے والی شعاعوں کے ذریعہ ستاروں کی عمروں کی تعیین کی طرح اس کی بنیاد بھی مفروضات پر ہے۔ اس بات میں کوئی امر مانع نہیں کہ کل دوسرے مفروضات سامنے آئیں جن سے عمروں کے یہ تخمینے بدل جائیں۔

فرض کیجئے کہ چٹانوں کی عمر یقین کے ساتھ متعین کی جاسکتی ہیں تو بھی اس میں کوئی امر مانع نہیں ہے کہ حیوانوں کی مختلف 'انواع' جو ایک دوسرے سے زیادہ ترقی یافتہ ہوں، زمین پر پائے جانے والے حالات کے سلسلہ میں زمانی اعتبار سے یکے بعد دیگرے وجود میں آتے رہے ہوں۔ کیونکہ اس وقت زمین پر جس قسم کے حالات تھے وہ انہی انواع کے لیے خصوصی سازگاری فراہم کرتے رہے ہوں۔ بعد میں جب زمین کے حالات بدل گئے اور بدلے ہوئے حالات بعض انواع کے لیے سازگار نہ رہ گئے تو یہ انواع ختم ہوگئیں لیکن اس سے یہ بات لازم نہیں آتی کہ ان میں سے ایک نوع دوسری نوع میں تبدیلی کے ذریعے اس میں سے نکلی ہو۔ ڈارون اور اس کے بعد لوگوں نے زمین کی تہوں میں سے جو چیزیں برآمد کی ہیں وہ اس سے زیادہ کچھ ثابت نہیں کرسکتیں وہ قطعی اور یقینی طور پر یہ ثابت کرنے سے قاصر ہیں کہ فلاں نوع جسمانی طور پر فلاں دوسری نوع سے ترقی کر کے نکلی ہے جو زمانی اعتبار سے اس سے قبل پائی گئی تھی — جیسا کہ ان چٹانوں کی تہوں اور قسموں کی بنا پر کہا جاسکتا ہے جن میں وہ پائی گئی ہیں۔ وہ صرف اتنا ثابت کرسکتی ہیں کہ زمانی اعتبار سے بعد میں پائی جانے والی نوع پہلے پائی جانے والی نوع سے

زیادہ ترقی یافتہ ہے۔ جیسا کہ ہم نے اوپر لکھا ہے۔ اس کی یہ توجیہہ بھی ممکن ہے کہ اس وقت زمین میں جو حالات پائے جاتے تھے وہ اسی نوع کے لیے سازگار تھے۔ پھر جب حالات بدل گئے تو ایک دوسری نوع کے ظہور کے لیے سازگار ہو گئے۔ چنانچہ یہ دوسری نوع ظاہر ہوئی اور حالات کی تبدیلی اس پہلی نوع کے خاتمہ کا سبب بنی جو اس سے پہلے مختلف حالات میں پائی گئی تھی۔

اس توجیہہ کی روشنی میں نوع انسانی کا آغاز (دوسری انواع سے) آزادانہ قرار پائے گا، جو اس زمانے میں واقع ہوا جب کہ اللہ تعالے کا فیصلہ یہ ہوا کہ اب زمین کے حالات ایسے ہو چکے ہیں کہ وہ اس مخصوص نوع کے وجود میں آنے اور پروان چڑھنے کے لیے سازگار رہیں۔ انسان کے ظہور کے بارے میں قرآن کریم کے نصوص بحیثیت مجموعی اسی رائے کو ترجیح دیتے ہیں۔

انسان حیاتیاتی، عضویاتی، عقلی اور روحانی اعتبار سے اتنا منفرد ہے کہ جدید ڈاروینیت کے علمبرداروں Neo-Darwinians نے جن میں خدا کے بالکل انکار کرنے والے بھی شامل ہیں، خود کو اس انفرادیت کے اعتراف پر مجبور پایا ہے۔ یہ اس رائے کے حق میں ایک مزید دلیل ہے کہ انسان کی اٹھان مستقل بالذات رہی ہے جسمانی ارتقاء کے ذریعے دوسری انواع میں شمولیت یا اشتراک کبھی نہیں پایا گیا ہے۔

چند صفحات کے بعد صفحہ ۱۴۹ پر تفسیر سورۂ اعراف رکوع ۲ سے متعلقہ مباحث کا خلاصہ بیان کرتے ہوئے مصنفؒ نے لکھا ہے:

"یہ منفرد مخلوق جس کے بارے میں قرآن کے تمام نصوص کو سامنے رکھتے ہوئے ہم اس رائے کو ترجیح دیتے ہیں۔ اگرچہ ہم قطعیت

نہیں اختیار کرتے۔ کہ اس کا ظہور آزادانہ ہوا ہے۔ اس کے ظہور کا اعلان ایک ایسی کائناتی مجلس میں کیا گیا جس میں ملاءِ اعلیٰ حاضر تھے"۔ [1]

---

[1] عربی عبارت یہ ہے: ۔ لقد اعلن میکاد ھذا الکائن المنفرد الذی نرجح من مجموعة النصوص القرآنية - ولا نجزم - ان نشاتہ کانت مستقلة - اعلن لھذا الميلاد في حفل كوني كان شهوده الملأ الاعلى- (جلد ۳ پارہ ۸ صفحہ ۱۴۹)
(مترجم)

وحی کی ضرورت و حکمت

اور سائنس

اَکَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا اَنْ اَوْحَیْنَآ اِلٰی رَجُلٍ مِّنْهُمْ اَنْ اَنْذِرِ النَّاسَ وَبَشِّرِ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنَّ لَهُمْ قَدَمَ صِدْقٍ عِنْدَ رَبِّهِمْ۔

کیا لوگوں کے لیے یہ ایک عجیب بات ہوگئی کہ ہم نے ــــ خود انھیں میں سے ایک آدمی کو وحی کی کہ (غفلت میں پڑے ہوئے) لوگوں کو چونکا دے اور جو مان لیں ان کو خوشخبری دے دے کہ ان کے لیے ان کے رب کے پاس سچی عزت اور سرفرازی ہے۔

اس سوال میں ایک نکیر پائی جاتی ہے۔ اس میں اس حیرت و استعجاب پر نکیر ظاہر کی گئی ہے جسے لوگوں نے رسالت کے آغاز ہی سے وحی کے سلسلے میں ظاہر کیا ہر دور میں رسولوں کو لوگوں کے جس سوال کا سامنا کرنا پڑا وہ یہی تھا کہ کیا خدا نے کسی انسان

لہ: ۔ فی ظلال القرآن ۔ پانچواں ایڈیشن ۱۹۶۷ جلد ۴ پارہ ۱۱ صفحات ۱۱۱ ۔ ۱۱۴ ۔

کو رسول بنا کر بھیجا ہے: اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا (الاسراء آیت ۹۴) لوگوں کے ذہنوں میں اس سوال کا پیدا ہونا یہ معنی رکھتا ہے کہ لوگوں نے "انسان" کی قدر وقیمت پہچانی ہی نہیں انھوں نے اپنے اندر چھپے ہوئے "انسان" کی قدر و قیمت پہچانی ہی نہیں۔ وہ اسے بڑی بات سمجھتے ہیں کہ کوئی انسان اللہ کا رسول ہو اور اللہ تعالےٰ (وحی کے ذریعے) اس سے آملے اور اس پر لوگوں کی رہنمائی کی ذمہ داری ڈالے۔ لوگ اس کا انتظار کرتے نظر آتے ہیں کہ (اس مقصد کے لیے) اللہ تعالیٰ کسی فرشتے یا اپنے نزدیک انسان سے بلند تر کسی مخلوق کو بھیجے۔ وہ یہ بات بھول جاتے ہیں کہ اللہ تعالےٰ نے اس مخلوق کو کس شرف و منزلت سے نوازا ہے۔ جس کی حد یہ ہے کہ وہ اسے رسالت کے بھاری بوجھ کو اٹھانے کے قابل سمجھتا ہے اور اس کے اندر سے ایسے لوگوں کا انتخاب فرماتا ہے جو (رشتۂ وحی کے ذریعے) انتہائی حدوں تک اس سے قریب ہو جاتے ہیں۔

یہی شبہ ہے جو عہد رسالت میں تکذیب کرنے والے کفار کو لاحق تھا اور بعینہٖ یہی شبہ تھا جس میں اس سے پچھلی امتوں کے کفار گرفتار تھے۔ دورِ جدید میں بعض لوگ اپنی طرف سے اسی طرح کے ایک شبے کا اظہار کرتے ہیں جو اپنی بیہودگی میں پہلے شبے سے ذرا بھی کم نہیں۔ ان کا سوال یہ ہے کہ ایک انسان کے درمیان جو مادی طبیعت کا مالک ہے اور اللہ تعالےٰ کے درمیان جو اپنی پیدا کی ہوئی ہر چیز کی طبیعت سے مغایر ہے اور جس کے مانند کوئی شیئ نہیں:

(لَیْسَ کَمِثْلِهٖ شَیْءٌ (الشوریٰ آیت ۱۱) کیسے اتصال ممکن ہے۔

اس طرح کا سوال اسی شخص کو زیب دے سکتا ہے جو اللہ سبحانہٗ و تعالےٰ

کی حقیقت کو اچھی طرح جانتا ہو اور انسان کی جملہ خصوصیات سے بھی واقف ہو جو اس نے اس کے اندر ودیعت فرمائی ہیں۔ اور یہ وہ چیز ہے جس کا ایک شخص ہرگز دعویٰ نہیں کر سکتا جو اپنی عقل کا احترام کرنا جانتا ہو اور ساتھ ہی اس عقل کے حدود و امکانات سے بھی بے بہرہ نہ ہو۔ بلکہ ساتھ ہی اس حقیقت سے بھی آشنا ہو کہ انسان کی وہ خصوصیات جن کی تحقیق و دریافت ممکن ہے، یکے بعد دیگرے ان میں نئی نئی چیزیں دریافت ہوتی رہتی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود تحقیق و جستجو کا سلسلہ بند نہیں ہوتا کہ یہ کہا جا سکے کہ:

انسان نے ان تمام انسانی خصوصیات کی کنہ پالی ہے جن کی تحقیق و دریافت ممکن تھی، صورتِ حال یہ ہے کہ سائنس اور عقل کی تمام دریافتوں کے بعد بھی نامعلوم حقائق کی ایک وسیع دنیا باقی رہتی ہے۔

معلوم ہوا کہ انسان کے اندر بہت سی نامعلوم طاقتیں ہیں جنھیں اللہ تعالے کے سوا کوئی اور نہیں جانتا۔ اللہ تعالے بہتر جانتا ہے کہ اس نوعِ انسانی میں سے کس فرد کو اپنی رسالت کا گہوارہ بنائے جو رسالت کا بوجھ اٹھانے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ اکثر و بیشتر یہ طاقت لوگوں کے لیے اجنبی ہوتی ہے بلکہ بسا اوقات تو صاحبِ رسالت بھی، رسالت سے پہلے، اس سے ناآشنا ہوتا ہے۔ لیکن اللہ تعالے جس نے انسان کے اندر اپنی روح پھونکی ہے، اچھی طرح جانتا ہے کہ (انسان کے جسم کا) ہر خلیہ، اس کا ہر عضو اور اس کا ہر حصہ کن خصوصیات کا مالک ہے۔ اور اپنے اندر کیا صلاحیتیں رکھتا ہے۔ اللہ تعالے اس بات پر قادر ہے کہ کسی انسان کے لیے (وحی کے ذریعہ حاصل ہونے والے) اس خاص اتصال کو ایسے طریقے سے آسان بنا دے جس کا

احساس بس اسی کو ہو سکتا ہے جسے یہ نعمت عطا ہوئی ہو۔

عصرِ حاضر کے بہت سے مفسرین نے، تقریبِ ذہنی کے لیے، وحی کو سائنس کے ذریعہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ ہم اس طریقِ استدلال کے سرے سے قائل ہی نہیں۔ اس لیے کہ سائنس کا ایک مخصوص میدان ہے اور سائنس کے طریقے اسی میدان کے لیے موزوں ہیں۔ سائنس کی دنیا الگ ہے اور اس کی تحقیق و تفتیش کے ذرائع اسی دنیا کے لیے کارگر ہیں۔ سائنس نے کبھی دعویٰ نہیں کیا کہ 'روح' کے بارے میں بھی اسے کوئی ثابت شدہ چیز معلوم ہے، کہ یہ چیز اس کے دائرہ عمل میں داخل ہی نہیں۔ اس لیے کہ یہ ایسی چیز ہی نہیں جسے جانچ پرکھ کر ان مادی طریقوں سے معلوم کیا جا سکے جس کے وسائل کہ سائنس کو حاصل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سائنسی طریقۂ تحقیق کے پابند علم نے ہمیشہ 'روحانیات' کے میدان میں دخل دینے سے گریز کیا ہے۔ رہی وہ چیز جسے ہم 'روحانی علوم' کے نام سے جانتے ہیں تو وہ اپنی حقیقت اور اپنے مقاصد دونوں کے اعتبار سے شکوک و شبہات سے لبریز ہیں۔

اس میدان میں کسی یقینی چیز کے جاننے کا ہمارے پاس کوئی راستہ نہیں سوائے ان حقائق کے جو قرآن و حدیث کے یقینی ذرائع سے ہم تک پہنچتے ہیں۔ اور یہ علم بھی ہمیں اسی حد تک حاصل ہو سکتا ہے جس حد تک کہ ان ذرائع سے ملا ہو۔ جس میں کسی اضافے، تصرف اور قیاس کی کوئی گنجائش نہیں اس لیے کہ اضافہ و تصرف اور قیاس آرائی عقلی اعمال ہیں۔ اور یہ عقل کا میدان نہیں، نہ عقل کو ان کاموں کے وسائل میسر ہیں۔ کیونکہ عقل کو اس میدان میں کام کرنے کے آلات و وسائل دیئے ہی نہیں گئے۔

اَکَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا اَنْ اَوْحَیْنَآ اِلٰی رَجُلٍ مِّنْهُمْ اَنْ اَنْذِرِ النَّاسَ وَبَشِّرِ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنَّ لَهُمْ قَدَمَ صِدْقٍ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۔ (یونس)

(کیا لوگوں کے لیے یہ ایک عجیب بات ہو گئی کہ ہم نے خود انھیں میں سے ایک آدمی کو وحی کی کہ (غفلت میں پڑے ہوئے) لوگوں کو چونکا دے اور جو مان لیں ان کو خوشخبری دیدے کہ ان کے لیے ان کے رب کے پاس سچی عزت اور سرفرازی ہے۔

یہی وحی کا خلاصہ ہے: یعنی لوگوں کو اس وحی کی مخالفت کے انجام سے ڈراتا اور مومنوں کو خوشخبری سنانا کہ (رسول کی) اطاعت و پیروی کا انھیں کیا بدلہ ملنے والا ہے۔ اور یہ اسی انذار و تبشیر کا تقاضا ہے کہ ان احکام کو بیان کر دیا جائے جو واجب الاتباع ہیں اور ان امور کو واضح کر دیا جائے جن سے اجتناب لازم ہے۔ اسی کا نام اجمالی طور پر انذار و تبشیر اور ان کے مقتضیات ہیں۔

یہ انذار و تبشیر تمام انسانوں کے لیے ہے۔ اس لیے کہ تمام انسان اس کے حاجتمند ہیں کہ ان تک پیغام پہنچایا جائے اسے اچھی طرح واضح کر دیا جائے اور (خلاف ورزی کے نتائج سے) انھیں پوری طرح ڈرا دیا جائے۔ اور بشارت صرف ان لوگوں کے لیے ہے جو ایمان لائیں چنانچہ اللہ تعالے یہاں انھیں طمانیت، ثبات اور استقرار کی بشارت دیتا ہے۔ یہ مفہوم ڈرانے کی فضا میں "قدم" کے ساتھ "صدق" کی اضافت سے مترشح ہوتا ہے۔ "قدم صدق"، یعنی مشکل گھڑی میں، ڈر اور سراسیمگی کی فضا میں انھیں "مضبوط قدم" رکھتے ہوئے بے کھٹکے۔ بغیر جھجکے اطمینان کے ساتھ

آنے کا موقع ملے گا۔ کہاں؟ اپنے رب کے حضور، ایسے دربار میں جس میں مومنوں کو اطمینان کامل نصیب ہو گا جب کہ دوسروں کے دل دہل رہے ہوں گے اور قدم ڈگمگا رہے ہوں گے۔

اس بات کی حکمت بالکل عیاں ہے کہ اللہ تعالے انسانوں ہی میں سے کسی فرد پر اپنی وحی نازل فرمائے۔ ایک ایسے فرد پر جو لوگوں کو خوب جانتا ہو اور لوگ اسے اچھی طرح جانتے ہوں انھیں اس پر پورا بھروسہ ہو اور وہ اس سے بلا تکلف اور کسی جھجک کے بغیر برابر لین دین کرتے ہوں۔ اور جہاں تک خود رسولوں کے بھیجے جانے کا تعلق ہے اس میں تو اس کی حکمت واضح تر ہے۔ اس لیے کہ اگرچہ انسان کو پیدائشی طور پر خیر و شر میں تمیز کی صلاحیت بخشی گئی ہے اور اس خیر و شر میں تمیز کے لیے عقل اسے بطور آلہ کے دی گئی ہے۔ لیکن اس عقل کو ایک اٹل پیمانے کی ضرورت ہے جس کی طرف وہ برابر رجوع کر سکے۔ جب بھی کوئی معاملہ اس پر دھندلا پڑے یا شکوک و شبہات اسے آگھیریں یا خواہشات و میلانات اسے اپنی طرف کھینچیں یا دوسرے اسباب و عوامل اس پر اثر انداز ہونے لگیں، وہ اسباب و عوامل جو انسان کے جسم اس کے اعصاب اور اس کے مزاج کو لاحق ہوتے رہتے ہیں۔ جس کے نتیجے میں عقل کے اندازے بھی تغیر و تبدل کا شکار ہوتے رہتے ہیں بلکہ بسا اوقات یہ تبدیلی اسے ایک چیز کو چھوڑ کر اس کے نقیض کی طرف لے جاتی ہے۔ اس لیے عقل کو ایک اٹل پیمانے کی ضرورت ہے، ایک پیمانے کی جو ان عارضی پیمانوں سے متاثر نہ ہو تاکہ وہ اس کی طرف رجوع کر سکے، اس سے رہنمائی لے سکے اور اس رہنمائی کی روشنی میں سیدھے راستے اختیار کر سکے۔ عدل پر مبنی یہ سچا

اور پکا پیمانہ اللہ کی ہدایت اور اس کی شریعت ہے۔

اس بات کا تقاضا ہے کہ اللہ کے دین کی کوئی مستقل حقیقت ہو جس کی طرف انسانی عقل، دین کے مختلف مفہومات کو لے کر رجوع کر سکے، اسی طور پر یہ ممکن ہوگا کہ (عقل) ان مفہومات کو اس اٹل پیمانے سے جانچے اور اس کے ذریعہ صحیح اور غلط میں تمیز کر سکے۔ یہ کہنا کہ اللہ کا دین "اللہ کے دین کا وہ مفہوم جو انسان سمجھیں" ہوتا ہے لہٰذا دین "اپنے اصولوں کے لحاظ سے تغیر پذیر ہے" اللہ کے دین کے بارے میں مذکورہ بالا بنیادی اصول یعنی اس کی حقیقت اور اس کے پیمانے کے غیر متغیر ہونے کو، انسانی فہم کے ساتھ ہمیشہ بدلتے رہنے اور اس کے مطابق ڈھلتے جانے کے خطرے میں ڈال دیتا ہے۔ کیونکہ اس رائے کے مطابق کوئی مستقل پیمانہ باقی نہیں رہ جاتا جس پر انسانی فہم کو پرکھا جا سکے۔

اس بات کے درمیان اور اس کے درمیان کہ "دین انسانی ذہن کی پیداوار ہے" بہت تھوڑا فاصلہ باقی رہ جاتا ہے اس لیے کہ دونوں کا آخری نتیجہ ایک ہی ہے۔ یہ ایک پرخطر پھسلن ہے اور انجام کے لحاظ سے انتہائی خطرناک ہے۔ اس طرز استدلال سے شدت سے اجتناب ضروری ہے۔ اس طرز استدلال سے بھی اور ساتھ ہی اس کے قریب اور دور کے نتائج سے بھی۔

باوجودیکہ اس طرح 'وحی' کا مقدمہ پوری طرح واضح ہو جاتا ہے پھر بھی کفار اس سے اس طور سے پیش آتے ہیں جیسے کوئی عجیب بات ہے۔

قَالَ الْكَافِرُونَ إِنَّ هَٰذَا لَسَاحِرٌ مُّبِينٌ۔

منکرین نے کہا یہ شخص تو کھلا جادوگر ہے۔ (یونس)

لوگ نبی کو ساحر قرار دیتے ہیں۔ کیوں؟ اس لیے کہ اس کی زبان سے جو چیز نکلتی ہے انہیں معجزہ دکھائی دیتی ہے۔ حالانکہ اگر وہ غور کرتے تو ان کے لیے یہ کہنا زیادہ مناسب ہوتا کہ یہ ایک نبی ہے جس پر وحی کا نزول ہوتا ہے اس لیے کہ اس کی زبان سے جو چیز نکلتی ہے معجزہ دکھائی دیتی ہے۔ اس لیے کہ سحر عظیم کائناتی حقائق، زندگی کے لیے نظام، حرکت و عمل کے لیے لائحہ عمل، مسائل زندگی میں رہنمائی اور قانون سازی جیسے مہمات مسائل جیسی کوئی چیز پیش نہیں کر سکتا جس پر ایک ترقی پذیر سماج قائم ہو سکے یا جس پر کسی منفرد نظام کی بنیاد رکھی جا سکے۔

ان کافروں کے نزدیک وحی و سحر ایک دوسرے کے ساتھ گڈمڈ ہو جاتے ہیں اس لیے کہ تمام بت پرست قوموں میں 'دین' سحر کے ساتھ گڈمڈ ہو گیا ہے فطری طور پر ان کے لیے وہ چیز کھل نہیں سکتی تھی جو ایک مسلمان پر روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے جب وہ اللہ کے دین کی حقیقت کو پالیتا ہے۔ اور بت پرستی اس کے اوہام و خرافات اور اس کے گورکھ دھندوں سے اسے نجات مل جاتی ہے۔

علم فلکیات اور قرآن

اَوَلَمْ يَرَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ ط

کیا وہ لوگ جنھوں نے (نبی کی بات ماننے سے) انکار کر دیا ہے۔ غور کر نہیں پاتے کہ یہ سب آسمان اور زمین باہم ملے ہوئے تھے۔ پھر ہم نے انھیں جدا کیا اور پانی سے ہر زندہ چیز پیدا کی[1]

مظاہر کائنات کی تشریح و تفسیر کے سلسلے میں فلکیات ASTRONOMY کے نظریات میں جیسے جیسے ترقی ہو رہی ہے اور وہ تیرہ سو سال سے زیادہ پہلے قرآن کی بیان کردہ اس حقیقت سے قریب آتے جا رہے ہیں ان کے پیش نظر قرآن کا یہ بیان کہ آسمان و زمین باہم ملے ہوئے تھے۔ پھر ہم نے انھیں جدا کیا غور و فکر کے لائق ہے۔

---

[1]: فی ظلال القرآن - پانچواں ایڈیشن ۱۹۶۷ء جلد ۵ - پارہ ۱۷ صفحہ ۲۴ - ۲۵

موجودہ نظریہ یہ ہے کہ ستاروں کے مجموعے — مثلاً نظام شمسی جو سورج اور اس کے گرد گھومنے والے سیاروں پر مشتمل ہے جن میں چاند اور سورج بھی شامل ہیں — پہلے ایک تھا، پھر اس نے الگ ہو کر مختلف کرّوں کی شکل اختیار کر لی۔ زمین بھی سورج کا ایک جز تھی پھر اس سے الگ ہو کر ٹھنڈی ہوئی۔ لیکن یہ بات فلکیات کا ایک نظریہ ہے جو آج مقبول ہے اور کل رد کیا جا سکتا ہے اور اس کی جگہ دوسرا نظریہ آ سکتا ہے جو کسی دوسرے مفروضے کی بنا پر مظاہر کائنات کی تفسیر زیادہ بہتر طور پر کرنے کے سبب نظریہ کا درجہ حاصل کرے۔

ہم اصحاب عقیدۂ قرآنی اس بات کی کوشش نہیں کرتے کہ قرآن کے یقینی نصوص کو کسی غیر یقینی نظریہ پر محمول کریں جو آج مقبول ہے اور کل رد کیا جا سکتا ہے۔ اس لیے ہم قرآن کریم کی اس تفسیر میں قرآن کے نصوص اور ان نظریات کے درمیان مطابقت دکھلانے کی کوشش نہیں کرتے جو سائنٹفک کہلاتے ہیں۔ واضح رہے کہ ان نظریات کی نوعیت ان ثابت شدہ سائنٹفک حقائق سے مختلف ہے جو تجربے کے قابل ہیں۔ مثلاً دھاتوں کا گرمی پا کر پھیلنا، یا پانی کا بھاپ بننا اور پھر ٹھنڈک کی وجہ سے منجمد ہو جانا..... وغیرہ دوسرے سائنٹفک حقائق جیسا کہ ہم اس میں پہلے بھی واضح کر چکے ہیں۔ ان حقائق کا مقام سائنٹفک نظریات سے مختلف ہے۔

قرآن نہ تو سائنٹفک نظریات کی کتاب ہے نہ وہ اس لیے آیا کہ تجربی طریقے سے سائنس مرتب کرے وہ پوری زندگی کے لیے ایک نظام ہے۔ یہ نظام عقل کی تربیت کرتا ہے تاکہ وہ اپنے حدود کے اندر آزادانہ سرگرم عمل ہو سکے۔ وہ سماج کو ایسا مزاج

عطا کرتا ہے کہ وہ عقل کو آزادانہ عمل کا پورا موقع دے۔ قرآن ایسی جزئیات اور تفصیلات سے تعرض نہیں کرتا جو خالص سائنٹفک ہوں۔ یہ امور عقل کی تربیت اور اس کے لیے آزادیِ عمل کے اتمام کے بعد عقل ہی کے لیے چھوڑ دیئے گئے ہیں۔

کبھی کبھی قرآن بعض کائناتی حقائق کی طرف اشارہ بھی کرتا ہے۔ مثلاً یہ حقیقت جس کا بیان آیت: ان السمٰوٰت والارض کانتا رتقاً ففتقناھما میں مذکور ہے۔ اس حقیقت پر ہمارے یقین کے لیے صرف یہ بات کافی ہے کہ یہ قرآن میں بیان ہوئی ہے۔ اگرچہ قرآن سے ہم کو یہ نہیں معلوم ہوتا کہ آسمانوں اور زمینوں کے جدا ہونے یا آسمان کے زمین سے جدا ہونے کا عمل کس طرح انجام پایا۔ ہم فلکیات کے ان نظریات کو قبول کرتے ہیں جو قرآن کی بیان کردہ اس مجمل حقیقت کے خلاف نہ جاتے ہوں۔ لیکن ہم قرآن کے بیان کو فلکیات کے کسی نظریے کے تابع نہیں بناتے نہ انسان کے نظریات سے قرآن کی تصدیق چاہتے ہیں۔

کیونکہ قرآن تو خود ایک یقینی حقیقت ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ فلکیات کے موجودہ نظریات اس نص قرآنی کے اجمالی مفہوم سے نہیں ٹکراتے اگرچہ یہ ان نظریات سے صدیوں پہلے آیا تھا۔

آیت کا دوسرا ٹکڑا "وجعلنا من الماء کل شیء حی" بھی ایک اہم حقیقت بیان کرتا ہے۔ سائنسداں اس حقیقت کی دریافت اور اثبات کو بڑی اہمیت دیتے ہیں۔ اس دریافت کا سہرا وہ ڈاروِن کے سر باندھتے ہیں! یہ حقیقت ہے کہ زندگی سب سے پہلے پانی کی آغوش میں پروان چڑھی۔

بلاشبہ اس حقیقت کا ادراک چونکا دینے والا ہے۔ مگر یہ بات کہ یہ قرآن کریم

میں مذکور ہے نہ ہمارے لیے باعث تعجب ہے نہ قرآن کی صداقت کے بارے میں ہمارے یقین کے اندر کوئی اضافہ کرتی ہے۔ کیونکہ قرآن کے تمام بیانات کی کامل صداقت پر ہمارا اعتقاد ہمارے اس ایمان سے ابھرتا ہے کہ وہ اللہ کی طرف سے ہے۔ سائنٹفک انکشافات یا نظریات سے ان بیانات کی مطابقت اس اعتقاد کا منبع نہیں ہے۔ یہاں ہم زیادہ سے زیادہ جو بات کہہ سکتے ہیں وہ یہ ہے کہ ڈاروِن اور اس کے رفقا کا نظریۂ نشوو ارتقا اس مخصوص نکتہ کی حد تک نصِ قرآنی کے مفہوم سے نہیں ٹکراتا۔

قرآن اور انسانی نشو و ارتقاء کا نظریہ

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ مِن سُلَالَةٍ مِّن طِينٍ ۝ ثُمَّ جَعَلْنَاهُ نُطْفَةً فِي قَرَارٍ مَّكِينٍ ۝ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظَامًا فَكَسَوْنَا الْعِظَامَ لَحْمًا ثُمَّ أَنشَأْنَاهُ خَلْقًا آخَرَ ۚ فَتَبَارَكَ اللَّهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِينَ ۝ ثُمَّ إِنَّكُم بَعْدَ ذَٰلِكَ لَمَيِّتُونَ ۝ ثُمَّ إِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ تُبْعَثُونَ ۝[1]

ہم نے انسان کو مٹی کے جوہر سے بنایا۔ پھر اسے محفوظ جگہ ٹپکی ہوئی بوند میں تبدیل کیا پھر اس بوند کو لوتھڑے کی شکل دی، پھر لوتھڑے کو بوٹی بنا دیا۔ پھر بوٹی کی ہڈیاں بنائیں۔ پھر ہڈیوں پر گوشت چڑھایا پھر اسے ایک دوسری ہی مخلوق بنا کھڑا کیا۔ پس بڑا ہی بابرکت ہے اللہ۔ سب

[1] فی ظلال القرآن، پانچواں ایڈیشن ۱۹۶۷ء جلد ۶۔ پارہ ۱۸ صفحہ ۱۴، ۱۷

کاریگروں سے اچھا کاریگر۔ پھر اس کے بعد تم کو ضرور مرنا ہے۔ پھر قیامت کے روز یقیناً تم اٹھائے جاؤ گے۔ (مومنون ۱۲-۱۴)

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ مِن سُلَالَةٍ مِّن طِينٍ۔ یہ نص انسان کی نشوونما کے مراحل کی طرف اشارہ کرتی ہے مگر ان کی تعیین نہیں کرتی۔ یہ بتاتی ہے کہ انسان ایک تسلسل کے ساتھ کچھ مراحل سے گذر کر مٹی سے انسان بنا ہے۔ مٹی مصدر اول یا پہلا مرحلہ ہے اور انسان آخری مرحلہ ہے۔ یہ حقیقت ہمیں قرآن سے معلوم ہوتی ہے ہم ان سائنٹفک نظریات میں اس کی مطابقت نہیں تلاش کرتے جو انسان کی نشوونما یا زندگی کے آغاز سے بحث کرتے ہیں۔

قرآن یہ حقیقت اس لیے بیان کرتا ہے کہ اسے خدا کی صنعت پر اور اس عظیم تبدیلی پر غور و تدبر کا مقام بنائے جو مٹی اور اس انسان کے درمیان پائی جاتی ہے جس نے اسی مٹی سے سلسلہ وار نشوونما پائی ہے۔ قرآن اس سلسلہ وار عمل کی تفصیل سے نہیں تعرض کرتا کیونکہ اس کے سامنے جو عظیم مقاصد ہیں، ان کے لیے ایسا کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ جہاں تک سائنٹفک نظریات کا تعلق ہے وہ نشوو ارتقا کا ایک متعین زینہ در زینہ عمل سامنے لانے اور اسے ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ انسان اور مٹی کے درمیان کے سلسلے کی مختلف کڑیوں کو ایک دوسرے سے جوڑ سکیں اس کوشش میں یہ سائنٹفک نظریات کامیاب بھی ہو سکتے ہیں اور غلطی بھی کر سکتے ہیں۔ جب کہ قرآن نے اس کی تفصیلات کے بارے میں خاموشی اختیار کی ہے۔ ہمارے لیے یہ مناسب نہ ہوگا کہ دو چیزوں کے درمیان خلط مبحث کریں۔ ایک چیز وہ ثابت شدہ حقیقت ہے جس کو قرآن بیان کرتا ہے۔ یعنی

سلسلہ وار عمل اور دوسری چیز وہ جس کی ——— کوشش سائنس کے نظریات کر رہے ہیں یعنی اس سلسلہ وار عمل کی کڑیوں کی دریافت ۔ یہی وہ کوشش ہے جس کے نتائج صحیح بھی ہو سکتے ہیں اور غلط بھی ۔ ایک بات آج صحیح قرار پاتی ہے اور کل کو انسانی تحقیق کے طریقوں اور تفتیش کے ذرائع کے آگے بڑھنے کے ساتھ غلط قرار پا سکتی ہے ۔

کبھی کبھی قرآن اسی حقیقت کا ذکر اختصار کے ساتھ ان الفاظ میں کرتا ہے کہ :-

بدأ خلق الانسان من طين

اللہ نے انسان کو بنانے کی ابتدا مٹی سے کی ۔

اور ان مراحل کی طرف کوئی اشارہ نہیں کرتا جن سے انسان گذرا ہے ۔ اس باب میں ہمیں اس نص کی طرف رجوع کرنا ہوگا جو زیادہ تفصیلی بیان سامنے لاتی ہو ۔ یہ وہ بیان ہے جو بتاتا ہے کہ " انسان مٹی کے جوہر " سے بنا ہے معلوم ہوا کہ مذکورہ بالا نص اپنے مخصوص سیاق کی رعایت سے ان مراحل کا ذکر مختصر کر دیتی ہے ۔

جہاں تک اس بات کا جواب ہے کہ انسان نے مٹی سے سلسلہ وار نشو و نما کس طرح پائی تو جیسا کہ ہم نے اوپر ذکر کیا قرآن اس بارے میں اس لیے خاموش ہے کہ یہ بتانا اس کے مقاصد میں نہیں داخل ہے ۔ ہو سکتا ہے کہ اس سلسلے کی کڑیاں اسی طور پر ہوں جیسا کہ سائنس کے نظریات بتاتے ہیں اور ہو سکتا ہے کہ مختلف ہوں ہو سکتا ہے کہ درمیانی مراحل کی نوعیت اور ان کے تکمیل پانے کی کیفیت کچھ اور ہو جو ابھی دریافت نہ کی جا سکی ہو، اور اس کے اسباب و عوامل بھی دوسرے ہوں جن

کا ابھی تک آدمی سراغ نہ لگا سکا ہو ۔ لیکن قرآن کے تصورِ انسان اور ان سائنٹفک نظریات کے تصور انسان کے درمیان بنیادی فرق یہ ہے کہ قرآن انسان کو مقام بلند کا حامل اور معزز قرار دیتا ہے اور یہ بتاتا ہے کہ اس میں خدا کی روح پھونکی گئی ہے اور اسی روح پھونکنے کے عمل نے اسے مٹی کے جوہر سے انسان بنایا ہے اور اسے وہ خصوصیات عطا کی ہیں جن کے طفیل وہ انسان بنا اور حیوان سے مختلف ہوا ۔ یہاں آ کر اسلام کا زاویۂ نگاہ مادیت پسندوں کے زاویۂ نگاہ سے بالکل مختلف اور جدا ہوتا ہے ۔ واللہ اصدق القائلین[1]

یہ نوع انسانی کے آغاز کے بارے میں تھا کہ وہ مٹی کے جوہر سے ہوا جہاں تک ایسا ہو چکنے کے بعد ایک فرد انسانی کی نشو و نما کا تعلق ہے اس کی راہ دوسری ہے ۔

(اس کے بعد ۷ سطروں میں مصنف نے رحم مادر میں جنین کے مرحلہ وار ارتقاء پر روشنی ڈالی ہے ۔ پھر فکسونا العظام لحمًا کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں)

" جنین کے بننے کے بارے میں قرآن نے جن حقائق پر سے پردہ اٹھایا ہے ان کو پڑھ کر آدمی حیران رہ جاتا ہے کیونکہ ان حقائق کی تفصیل زمانۂ حال میں جنین کے مراحل کی تشریح کرنے والے علم کی ترقی کے بعد سامنے آئی ہے یعنی یہ بات کہ ہڈی کے خلیے گوشت کے خلیوں سے جدا اور مختلف ہوتے ہیں ۔ اب یہ بات

---

[1] محمد قطب کی کتاب "الانسان بین المادیۃ والاسلام" کا مطالعہ کیجئے (مصنف)

ثابت ہو چکی ہے کہ جینن میں پہلے ہڈی کے خلیے تشکیل پاتے ہیں۔ ہڈی کے خلیوں کے
نمودار ہونے اور جینن کا ڈھانچہ مکمل ہونے سے پہلے گوشت کا ایک خلیہ بھی نہیں پایا جاتا۔
یہی وہ حقیقت ہے جس کو نص قرآنی فخلقنا المضغة عظاماً فکسونا العظام لحماً
میں بیان فرمایا گیا ہے۔ سبحان العلیم الخبیر۔

ثم انشانا ہ خلقاً آخر ...... یہ ہے وہ انسان جو امتیازی خصوصیات
کا حامل ہے کیونکہ انسان کا جنین اپنے جسمانی مراحل میں حیوانی جنین کے مشابہ ہوتا ہے
لیکن انسان کا جنین ایک اور ہی مخلوق بن جاتا ہے۔ وہ ممتاز مخلوق جو ارتقاء کی صلاحیت
رکھتی ہے، جب کہ حیوان کا جنین حیوان ہی کے درجہ میں رہ جاتا ہے اور ترقی کرنے
اور کمال تک پہنچنے کی ان خصوصیات سے محروم رہتا ہے جو انسانی جنین کا مابہ الامتیاز
ہیں۔

انسانی جنین میں کچھ ایسی خصوصیات رکھی گئی ہیں جن کے طفیل وہ بعد کے
مراحل میں انسانی راہ اختیار کر لیتا ہے اور وہ جنینی مراحل کے آخر میں "ایک دوسری
مخلوق" بن جاتا ہے۔ جب کہ حیوانی جنین حیوانی مرحلہ ہی میں رہ جاتا ہے کیونکہ اسے
یہ خصوصیات نہیں دی گئی ہیں۔ معلوم ہوا کہ حیوان کے لیے یہ ممکن نہیں کہ وہ اپنے
حیوانی مرتبے سے تجاوز کر کے مرحلہ در مرحلہ میکانکی طور پر انسان کے مرتبہ تک پہنچ
جائے جیسا کہ مادی نظریات کا کہنا ہے ——— حیوان اور انسان دو بالکل مختلف
انواع ہیں جن میں اس خدائی روح پھکنے کے سبب فرق ہو گیا جس کے طفیل مٹی
کا جوہر انسان بنا۔ دونوں کے درمیان فرق کی وجہ اس روح کا پھونکا جانا بھی ہے
جس کے طفیل کچھ ایسی خصوصیات پیدا ہوئیں جنھوں نے انسانی جنین کو ایک دوسری

مخلوق بنا کر نکالا۔ انسان اور حیوان صرف حیوانی (جسمانی) بناوٹ میں ایک دوسرے کے
مشابہ رہتے ہیں، پھر حیوان حیوان ہی رہ جاتا ہے۔ اس مقام سے آگے نہیں بڑھتا،
جب کہ انسان ایک دوسری مخلوق بن جاتا ہے جس میں اس کمال تک پہنچنے کی صلاحیت
ہے، جس کے لیے اسے بنایا گیا ہے۔ ایسا ان امتیازی خصوصیات کے طفیل ہی ممکن ہوا
جنھیں اللہ نے اسے ایک بامقصد تدبیر کے تحت عطا فرمایا ہے نہ کہ نوع حیوانی سے
میکانکی طور پر مرحلہ وار تبدیلیوں کے ذریعے نوع انسانی میں بدل جانے کے سبب [1]

---

[1] نظریہ نشوو ارتقاء ایک کمزور بنیاد پر قائم ہے کیونکہ یہ نظریہ یہ فرض کر لیتا ہے کہ انسان حیوانی
ترقی کے ایک مرحلے کے سوا کچھ بھی نہیں وہ یہ بھی فرض کر لیتا ہے کہ حیوان انسان کے مرتبے
تک مرحلہ وار تبدیلیوں کے ذریعے پہونچنے والی خصوصیات کا حامل ہے، مشاہدے میں آنے
والے حقائق انسان اور حیوان کے درمیان رشتے کی وضاحت کے سلسلے میں اس مفروضے
کی تردید کرتے ہیں اور یہ بتاتے ہیں کہ حیوان ان خصوصیات کا حامل نہیں ہوتا چنانچہ وہ
ہمیشہ اپنی حیوانی جنس کے حدود پر آ کر رک جاتا ہے اس سے آگے نہیں بڑھنے پاتا۔ انسان
کا حیوانی (جسمانی) ارتقاء ہو سکتا ہے کہ اس طرح ہوا ہو جس طرح ڈارون نے بیان کیا ہے
اور ہو سکتا ہے کسی اور طرح ہوا ہو لیکن نوع انسانی اس حد تک ممتاز ہے کہ وہ کچھ مخصوص
صلاحیتوں کی حامل ہے جو اسے انسان بناتی ہیں، اور یہ خصوصیات میکانکی ارتقاء کا نتیجہ
نہیں ہیں وہ کسی خارجی قوت کا دیا ہوا بامقصد عطیہ ہیں۔

(مصنف)

ابتدائے خلق پر دعوتِ غور و فکر

قُلْ سِيْرُوْا فِي الْأَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ بَدَأَ الْخَلْقَ ثُمَّ اللّٰهُ يُنْشِئُ النَّشْأَةَ الْآخِرَةَ ۚ إِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝

(ان سے کہو کہ زمین میں چلو پھرو اور دیکھو کہ اس نے کس طرح خلق کی ابتدا کی ہے۔ پھر اللہ بارِ دگر بھی زندگی بخشے گا۔ یقیناً اللہ ہر چیز پر قادر ہے)

یہاں زمین میں چل پھر کر اس امر پر غور کرنے کا حکم دیتے وقت کہ اللہ نے خلق کا آغاز کیسے کیا ہے۔ ماضی کا صیغہ استعمال کرنا دل میں ایک خاص خیال پیدا کرتا ہے ...... یہ کہ زمین کے اندر ایسی چیزیں موجود ہیں جو پہلی بار زندگی کے ظہور اور اس ظہور کی کیفیت کی طرف رہنمائی کر سکیں۔ مثلاً زمین کی کھدائی سے برآمد ہونے والی چیزیں جن کے مطالعہ سے آج کل بعض سائنس داں زندگی کی تاریخ مرتب کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ کیسے شروع ہوئی، کیسے پھیلی اور اس نے کیسے ارتقا پایا؟ ——— اگرچہ یہ

۱؎: فی ظلال القرآن۔ پانچواں ایڈیشن، ۱۹۶۷ء جلد ۶ پارہ ۲۰ صفحہ ۱۱۹-۱۲۰۔

سائنس داں زندگی کا راز دریافت کرنے میں بالکل ناکام رہے ہیں کہ اس کی ماہیت کیا ہے؟ وہ زمین پر کہاں سے آئی اور زمین پر پہلا جاندار کیسے وجود میں آیا؟ اس مفہوم کے لحاظ سے یہاں اللہ نے پہلی بار زندگی کے ظہور کی تحقیق و تفتیش کی طرف توجہ دلائی ہے اور اس بات کی ترغیب دی ہے کہ اس کے بارے میں واقفیت حاصل ہو جانے پر اس سے دوبارہ زندگی پانے پر استدلال کیا جائے۔

اس خیال کے ساتھ ایک دوسرا خیال بھی آتا ہے۔ وہ یہ کہ جو لوگ اس آیت کے اولین مخاطب تھے وہ اس طرح کی سائنٹفک تفتیش کی صلاحیت سے محروم تھے جو زمانہ حال میں شروع ہوئی ہے۔ لہٰذا اس زمانے میں ان کے اندر اس کی استطاعت نہ تھی کہ اس طریقے سے اس حقیقت کا پتہ چلا سکیں جس کی دریافت مقصود تھی۔ بشرطیکہ آیت کا مقصد یہی قرار پائے۔ لہٰذا یہ رائے اختیار کرنا ناگزیر معلوم ہوتا ہے کہ قرآن ان سے کسی دوسرے کام کا مطالبہ کر رہا تھا جس کا انجام دینا ان کے لیے ممکن تھا اور جس کے ذریعے وہ جس حد تک ممکن ہوتا، دوسری بار زندگی پانے کا تصور سمجھ سکتے۔ اس مفہوم کے لحاظ سے آیت کا مطالبہ یہ قرار پائے گا کہ وہ لوگ اس بات پر غور کریں کہ مختلف علاقوں میں نباتات، حیوانات اور انسانوں میں زندگی کا آغاز کس طرح ہوتا ہے۔ اس صورت میں زمین میں چلنے پھرنے کی دعوت کا مقصد نئے مشاہدات و مناظر کے ذریعے شعور و ادراک میں تازگی اور بیداری پیدا کرنا ہوگا تاکہ وہ اس زندگی کے پیدا کرنے کے سلسلے میں قدرتِ الٰہی کے آثار پر غور و فکر کر سکے جو دن اور رات کے ہر لمحے سامنے آتے رہتے ہیں۔

ایک اور مفہوم ممکن ہے جو زیادہ اہم اور اس قرآن کے مزاج سے زیادہ

مناسبت رکھنے والا ہے وہ یہ کہ قرآن کی رہنمائی انسانوں کی تمام نسلوں کے لیے، ہر ذہنی سطح کے لوگوں کے لیے ہر طرح کے حالات میں اور ہر طرح کے وسائل و ذرائع کے ساتھ گذاری جانے والی زندگی کے لیے ہے۔ چنانچہ وہ اس رہنمائی کو اس طرح پیش کرتا ہے تاکہ ہر ایک اس سے اس قدر اخذ کر سکے جس قدر اس کے حالاتِ زندگی اور وسائل و استعداد اس کے لیے ممکن بنا سکیں۔ اس رہنمائی میں ہمیشہ ترقی پذیری باقی رہتی ہے تاکہ زندگی آگے بڑھ سکے اور یہ رہنمائی اس کی قیادت کرتی رہے۔ اس تعبیر کی روشنی میں مذکورہ بالا دونوں خیالوں کے درمیان کوئی تعارض نہیں رہ جاتا۔

یہی بات زیادہ موزوں اور اقرب الی الصواب ہے۔

روحانی اور عقلی نشو و ارتقا

إِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَائِكَةِ إِنِّي خَالِقٌ بَشَرًا مِنْ طِينٍ۔ فَإِذَا سَوَّيْتُهُ وَنَفَخْتُ فِيهِ مِنْ رُوحِي فَقَعُوا لَهُ سَاجِدِينَ ۝[1]

جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا "میں مٹی سے ایک بشر بنانے والا ہوں۔ پھر جب میں اسے پوری طرح بنا دوں اور اس میں اپنی روح پھونک دوں تو تم اس کے آگے سجدے میں گر جاؤ۔"

آیت کی تشریح میں چند سطروں کے بعد لکھتے ہیں:۔

ہم روح پھونکنے کی کنہ سے تو ناواقف ہیں مگر اس کے اثرات جانتے ہیں۔ یہ اسی کے اثرات ہیں جنھوں نے اس انسان کو اس زمین کی تمام دوسری مخلوقات سے

[1] : فی ظلال القرآن۔ پانچواں ایڈیشن ۱۹۶۷ء۔ جلد ۷، پارہ ۲۳۔ ص ۱۰۹

ممتاز کر دیا ہے۔ اس نے اسے عقلی اور روحانی ارتقا کی خصوصیت عطا کی ہے۔ اس کے طفیل عقل انسانی ماضی کے تجربات پر غور کرتی اور مستقبل کے لیے منصوبے بناتی ہے اور اسی کا فیضان ہے کہ انسان کی روح عقل اور حواس کی مدد سے حاصل کی جا سکنے والے علم سے آگے بڑھ کر ان امور تک رسائی حاصل کر لیتی ہے جو عقل و حواس کے لیے مجہول ہیں۔

عقلی اور روحانی ارتقا کی خصوصیت خالصتاً انسانی خصوصیت ہے زمین پر بسنے والا کوئی دوسرا جاندار اس خصوصیت میں انسان کا شریک نہیں۔

پہلے انسان کی پیدائش کے وقت مختلف انواع و اجناس کے جاندار موجود تھے مگر اس طویل تاریخ میں ایسا کبھی نہیں ہوا کہ کسی نوع یا جنس نے، یا اس کے کسی ایک فرد نے بھی عقلی اور روحانی طور پر ترقی کی ہو۔ اگر ہم اعضائے جسم کی حد تک ارتقا تسلیم بھی کر لیں تو بھی یہ (عقلی اور روحانی طور پر دوسرے جانداروں کا ارتقا نہ کرنا) ایک حقیقت ہے۔

زندگی کا اصول ایک ہی ہے

وَاللَّهُ أَنْبَتَكُمْ مِنَ الْأَرْضِ نَبَاتًا ۝ ثُمَّ يُعِيدُكُمْ فِيهَا وَيُخْرِجُكُمْ إِخْرَاجًا ۝ (نوح ۱۷، ۱۸)

اور اللہ نے تم کو زمین سے اگایا۔ پھر تم کو دوبارہ اسی میں لے جائے گا اور پھر تمھیں باہر نکالے گا[1]

زمین سے انسان کی اٹھان کی تعبیر "اگانے" سے کرنا ایک عجیب اور معنی خیز تعبیر ہے۔ یہ تعبیر مختلف شکلوں میں قرآن میں بار بار آتی ہے۔

[1] :۔ فی ظلال القرآن۔ پانچواں ایڈیشن ۱۹۶۷ء جلد ۸ پارہ ۲۹ صفحہ ۱۲۹۔

بلاشبہ یہ منظر غور و فکر کی دعوت دیتا ہے ۔ اس میں یہ اشارہ مضمر ہے کہ زمین پر زندگی کا اصول ایک ہی ہے ، اور یہ کہ زمین سے انسان بھی اسی طرح نکلا ہے جس طرح نباتات ۔ وہ اسی کے بنیادی عناصر سے تشکیل پاتا ہے، اور اسی کے بنیادی عناصر سے غذا حاصل کرتا اور پروان چڑھتا ہے ۔ پس وہ اسی کی نباتات میں سے ایک ہے جسے اللہ تعالیٰ نے زندگی کی اس قسم سے نوازا ہے جس طرح نباتات کو زندگی کی دوسری قسم عطا کی ہے۔ دونوں زمین کی پیداوار ہیں اور دونوں اسی ماں کے دودھ پر پروان چڑھتے ہیں ۔

اس طرح ایمان مومن کے اندر زمین اور دوسرے جانداروں سے اس کے رشتے کا ایک حقیقی اور جاندار تصور پیدا کرتا ہے ایسا تصور جس میں علم کی باریکی اور احساس کی قوت اور تازگی ہے کیونکہ وہ ضمیر میں زندہ حقیقت پر مبنی ہے ۔ یہ قرآن کے اچھوتے طریقۂ معرفت کا امتیازی وصف ہے ۔